
شاہکار



کارخانہ دارالصحت کا ایک بے نظیر تحفہ





جسمانی درد، زخم، چوٹ
موچ، کٹنے، جلنے اور
بچوں کے سردی لگ جانے
میں مفید
ہے

جسکو
خرید کر
آپ
خاندان کے ہر فرد کو بیک وقت
ان مرضوں میں فوری فائدہ
پہونچا سکتے ہیں۔

کارخانہ دارالصحت، مئوناتھ بھنجن، یو۔پی

اردو کے رسائل کا انتخاب پیش کرنے والا واحد ماہنامہ

شاہکار

نمبر ۴۲

ایڈیٹر
محمود احمد ہنر

مجلس مشاورت

سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
خلیل الرحمن اعظمی
مہندر ناتھ
مظفر شاہجہانپوری

قیمت
فی پرچہ ——— ایک روپیہ
سالانہ ——— دس روپے



دفتر شاہکار، ممتاز باغ لوکر گنج الہ آباد ۲
بمبئی آفس :- ڈائمنڈ لاج سکندر پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸

ممتاز الحق پرنٹر پبلشر نے اسرار کریمی پریس، الہ آباد میں چھپوا کر دفتر شاہکار ممتاز باغ لوکر گنج الہ آباد سے شایع کیا۔

ترتیب

افسانے و خاکے

نظمیں

مضمون

غزلیں

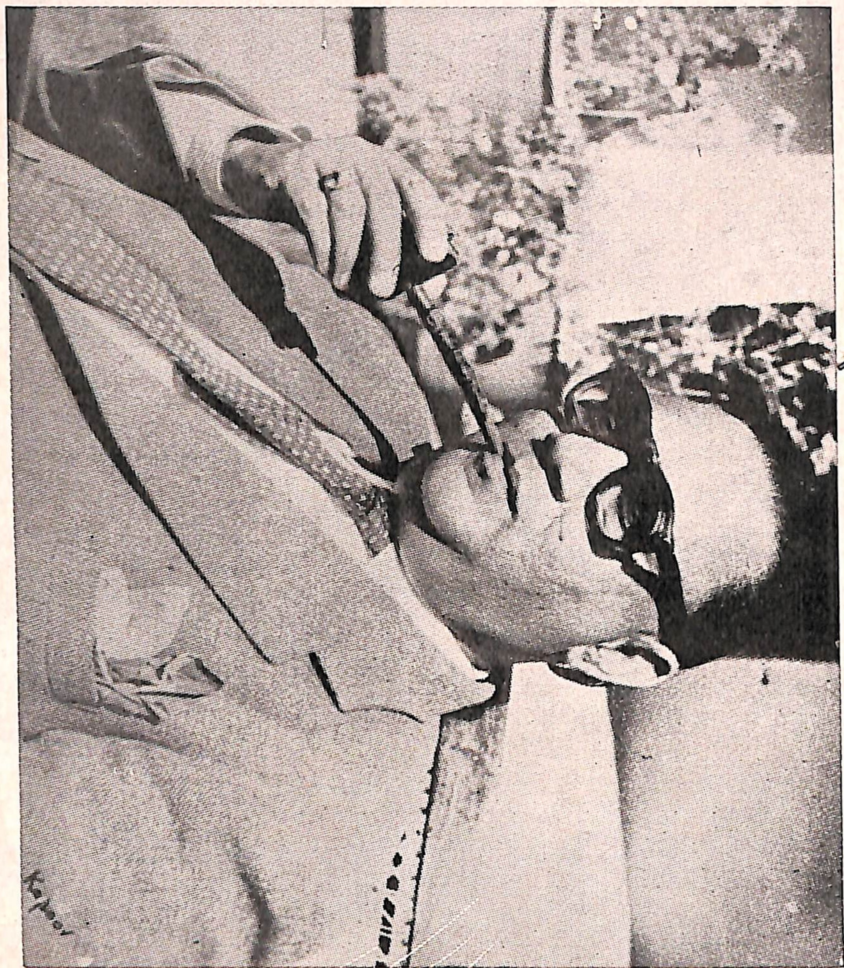
مزاح

تبصرے

اپنی بات

ابھی گذشتہ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے نشانات باقی ہیں، ابھی ان بیواؤں کے آنسو خشک نہیں ہو پائے جن کا سہاگ اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور ابھی تک وہ مائیں اپنے جگر گوشوں کی یاد میں روتی ہوں گی جنھیں جنگ کے مہیب دیو نے اپنا لقمہ بنا لیا کہ ہمارے ہمسایہ ملکوں نے پھر ایک بار جنگ کے شعلوں میں ایشیا بلکہ دنیا کو جھلس دینے کی ٹھان لی۔

چند سال قبل ہمیں چینی جارحیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور اس بار پاکستان نے ہمیں اپنی علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لئے لڑنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کی طرح اس بار بھی پاکستان نے کشمیر میں اپنے آدمی بھیج کر تخریب کاری کی کوشش کی لیکن کشمیری عوام نے نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ پاکستان کی اس سازش کو ناکام بنا دیا کہ وہ طاقت کے زور پر یا اسلام اور جہاد کے نعروں سے کشمیری مسلمانوں کو گمراہ کر کے انہیں اپنا محکوم بنا لے گا۔ پاکستان کی بے قاعدہ اور باقاعدہ فوج کو کشمیر سے دور رکھنے کے لئے ہماری فوجوں کو مغربی پاکستان کے ان فوجی مستقروں اور راستوں پر حملہ کرنا پڑا جہاں سے پاکستان کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے اپنی فوجیں بھیجتا تھا۔ جنگ ہوتی رہی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور کروڑوں روپوں کا نقصان ہوا۔ اب پھر بے گھر اپنے گھروں کے لئے، بچے اپنے باپوں کے لئے، مائیں اپنے بیٹوں کے لئے اور بیوائیں اپنے سہاگ کے لئے ماتم کریں گی اور اس ساری خونریزی اور تباہ کاری کی ذمہ داری پاکستانی حکمرانوں پر ہوگی جو قیام پاکستان کے بعد ہمیشہ جنگ کے نعرے لگاتے رہے اور ہماری شرافت اور امن پسندی کو ہماری کمزوری پر محمول کرتے رہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۴۱)



۵

کرشن چندر

جامن کا پیڑ

رات کو بڑے زور کا جھکڑ چلا۔ سکریٹریٹ کے لان میں جامن کا ایک درخت گر پڑا۔ صبح جب مالی نے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ درخت کے نیچے ایک آدمی دبا پڑا ہے!

مالی دوڑا دوڑا چپراسی کے پاس گیا۔ چپراسی دوڑا دوڑا کلرک کے پاس گیا۔ کلرک دوڑا دوڑا سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا۔ سپرنٹنڈنٹ دوڑا دوڑا باہر لان میں آیا۔ منٹوں میں گرے ہوئے درخت کے نیچے دبے ہوئے آدمی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔!

"بے چارہ جامن کا پیڑ! کتنا پھلدار تھا" ایک کلرک بولا۔

"اور اس کی جامنیں کتنی رسیلی ہوتی تھیں!" دوسرا کلرک یاد کرتے ہوئے بولا۔

"میں پھلوں کے موسم میں جھولی بھر کے لے جاتا تھا۔ میرے بچے اس کی جامنیں کتنی خوشی سے کھاتے تھے" تیسرا کلرک تقریباً آبدیدہ ہو کر بولا۔

"مگر یہ آدمی —؟" مالی نے دبے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا —!

"ہاں۔ یہ آدمی —!" سپرنٹنڈنٹ سوچ میں پڑ گیا۔

"پتہ نہیں زندہ ہے کہ مر گیا؟" ایک چپراسی نے پوچھا۔

"مر گیا ہو گا، اتنا بھاری تنا جس کی پیٹھ پر گرے وہ بچ کیسے سکتا ہے؟" دوسرا چپراسی بولا۔

"نہیں میں زندہ ہوں!" دبے ہوئے آدمی نے بمشکل کراہتے ہوئے کہا۔

"زندہ ہے!" ایک کلرک نے حیرت سے کہا۔

"درخت کو ہٹا کر اسے جلدی سے نکال لینا چاہئے۔" مالی نے مشورہ دیا۔

"مشکل معلوم ہوتا ہے۔" ایک کاہل اور موٹا چپراسی بولا۔ "درخت کا تنا بہت بھاری اور وزنی ہے!"

"کیا مشکل ہے؟" مالی بولا۔ "اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب حکم دیں تو ابھی پندرہ بیس مالی، چپراسی اور کلرک لگا کر درخت کے نیچے سے دبے ہوئے آدمی کو نکالا جا سکتا ہے۔"

"مالی ٹھیک کہتا ہے" بہت سے کلرک ایکدم بول پڑے۔ "لگاؤ زور۔ ہم تیار ہیں!"

ایکدم بہت سے لوگ درخت کو اٹھانے پر تیار ہو گئے!

"ٹھہرو!" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "میں انڈر سکریٹری سے مشورہ کر لوں۔"

سپرنٹنڈنٹ انڈر سکریٹری کے پاس گیا۔ انڈر سکریٹری ڈپٹی سکریٹری کے پاس گیا۔ ڈپٹی سکریٹری جائنٹ سکریٹری کے پاس گیا۔ جائنٹ سکریٹری چیف سکریٹری کے پاس گیا۔ چیف سکریٹری منسٹر کے پاس گیا۔ منسٹر نے چیف سکریٹری سے کچھ کہا۔ چیف سکریٹری نے جائنٹ سکریٹری سے کچھ کہا۔ جائنٹ سکریٹری نے ڈپٹی سکریٹری سے کہا۔ ڈپٹی سکریٹری نے انڈر سکریٹری سے کہا۔ فائل چلتی رہی اسی میں آدھا دن گزر گیا۔!

دوپہر کے کھانے پر دبے ہوئے آدمی کے گرد بہت بھیڑ ہو گئی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ من چلے کلرکوں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ وہ حکومت کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر درخت کو خود سے ہٹا دینے کا تہیہ کر رہے تھے کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ فائل لئے بھاگا بھاگا آیا۔ بولا

"ہم لوگ خود سے اس درخت کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمہ تجارت سے متعلق ہیں اور یہ درخت کا معاملہ ہے، جو محکمۂ زراعت کی تحویل میں ہے۔ اس لئے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمۂ زراعت میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آتے ہی اس درخت کو ہٹوا دیا جائے گا۔!"

دوسرے دن محکمہ زراعت سے جواب آیا کہ درخت محکمۂ تجارت کے لان میں گرا ہے اس لئے اس درخت کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمہ تجارت پر عائد ہوتی ہے۔

یہ جواب پڑھ کر محکمۂ تجارت کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے فوراً لکھا کہ پیڑوں کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ زراعت پر عائد ہوتی ہے۔ محکمۂ تجارت کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرے دن بھی فائل چلتی رہی۔ شام کو جواب آ گیا۔ ہم اس معاملہ کو ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک پھلدار درخت کا معاملہ ہے اور ایگری کلچرل ڈیپارٹمنٹ صرف

اناج اور کھیتی باڑی کے معاملوں میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔ جامن کا پیڑ ایک پھلدار پیڑ ہے۔ اس لئے یہ پیڑ
ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔!

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کو دال بھات کھلایا۔ حالانکہ لان کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ تھا کہ
کہیں لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کے درخت کو خود سے ہٹوانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ایک پولیس کانسٹیبل
کو رحم آگیا اور اس نے مالی کو دبے ہوئے آدمی کو کھانا کھلانے کی اجازت دے دی۔

مالی نے دبے ہوئے آدمی سے کہا۔ "تمہاری فائل چل رہی ہے۔ امید ہے کل تک فیصلہ ہو جائے گا!"

دبا ہوا آدمی کچھ نہیں بولا۔

مالی نے پیڑ کے تنے کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "خیریت گزری کہ تنا تمہارے کولھے پر گرا۔ اگر کمر پہ گرتا تو
ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔!"

دبا ہوا آدمی پھر بھی کچھ نہیں بولا۔

مالی نے پھر کہا۔ "تمہارا یہاں کوئی وارث ہے تو مجھے اس کا اتہ پتہ بتاؤ۔ میں انہیں خبر دینے
کی کوشش کروں گا!"

"میں لاوارث ہوں۔" دبے ہوئے آدمی نے بڑی مشکل سے کہا۔

مالی افسوس ظاہر کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

تیسرے دن ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے جواب آگیا۔ بڑا کڑا جواب تھا اور طنز آمیز۔ ہارٹی کلچرل
ڈیپارٹمنٹ کا سکریٹری ادبی مزاج کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لکھا تھا "حیرت ہے۔ اس سمے جب ہم
"درخت اگاؤ" اسکیم بڑے پیمانے پر چلا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے سرکاری افسر موجود ہیں جو
درختوں کو کاٹنے کا مشورہ دیتے ہیں اور وہ بھی ایک پھلدار درخت کو۔ اور وہ بھی جامن کے درخت کو
جس کے پھل عوام بڑی رغبت سے کھاتے ہیں؟"

"ہمارا محکمہ کسی حالت میں اس پھلدار درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔!"

"اب کیا کیا جائے؟" ایک من چلے نے کہا۔ "اگر درخت کاٹا نہیں جا سکتا، تو اس آدمی کو کاٹ
کر نکال لیا جائے۔"

"یہ دیکھئے" اس آدمی نے اشارہ سے بتایا" اگر اس آدمی کو عین بیچ میں سے یعنی دھڑ کے مقام سے کاٹا جائے تو آدھا آدمی ادھر نکل آئے گا۔ آدھا آدمی ادھر سے باہر آجائے گا اور درخت وہیں کا وہیں رہے گا — !"

"مگر اس طرح سے تو میں مرجاؤں گا!" دبے ہوئے آدمی نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی ٹھیک کہتا ہے" ایک کلرک بولا۔

آدمی کو کاٹنے والی تجویز پیش کرنے والے نے پرزور احتجاج کیا" آپ جانتے نہیں ہیں۔ آج کل پلاسٹک سرجری کتنی ترقی کر چکی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اس آدمی کو بیچ میں سے کاٹ کر نکال لیا جائے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے دھڑ کے مقام پر اس آدمی کو پھر سے جوڑا جا سکتا ہے"

اب کے فائل کو میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ نے فوراً اس پر ایکشن لیا۔ اور جس دن فائل ان کے محکمے میں پہنچی، اس کے دوسرے ہی دن انہوں نے اپنے محکمے کا سب سے قابل پلاسٹک سرجن تحقیقات کے لئے بھیج دیا۔ سرجن نے دبے ہوئے آدمی کو اچھی طرح ٹٹول کر، اس کی صحت دیکھ کر، خون کا دباؤ، سانس کی آمد رفت، دل اور پھیپھڑوں کی جانچ کر کے رپورٹ بھیج دی کہ اس آدمی کا پلاسٹک آپریشن تو ہو سکتا ہے اور آپریشن کامیاب ہو جائے گا۔ مگر آدمی مر جائے گا۔!

لہٰذا یہ تجویز بھی رد کر دی گئی!

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لقمے ڈالتے ہوئے اسے بتایا" اب معاملہ اوپر چلا گیا ہے — سنا ہے کہ کل سکریٹریٹ کے سارے سکریٹریوں کی میٹنگ ہو گی۔ اس میں تمہارا کیس رکھا جائے گا۔ امید ہے سب کام ٹھیک ہو جائے گا"

دبا ہوا آدمی ایک آہ بھر کے آہستہ سے بولا۔

"ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن   خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک"

مالی نے اچنبھے سے منہ میں انگلی دبائی۔ حیرت سے بولا" کیا تم شاعر ہو؟"

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

دوسرے دن مالی نے چپراسی کو بتایا۔ چپراسی نے کلرک کو۔ کلرک نے ہیڈ کلرک کو۔ تھوڑے ہی

عرصے میں سکریٹریٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ بس پھر کیا تھا لوگ جوق در جوق شاعر کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ اس کی خبر شہر میں پھیل گئی اور شام تک محلّے محلّے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سکریٹریٹ کا لان بھانت بھانت کے شاعروں سے بھر گیا اور دبے ہوئے آدمی کے گرد ایک مشاعرہ بپا ہو گیا۔ سکریٹریٹ کے کئی کلرک اور انڈر سکریٹری تک جنھیں ادب اور شعر سے لگاؤ تھا، رک گئے۔ کچھ شاعر دبے ہوئے آدمی کو اپنی غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ کئی کلرک اس سے اپنی غزلوں پر اصلاح لینے کے لئے مصر ہونے لگے۔

جب یہ پتہ چلا کہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے تو سکریٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ چونکہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے لہٰذا اس فائل کا تعلق نہ ایگری کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہے نہ ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ سے بلکہ صرف کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ——— کلچرل ڈپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی کہ جلد از جلد اس معاملے کا فیصلہ کر کے بدنصیب شاعر کو اس شجرِ سایہ دار سے رہائی دلائی جائے۔

فائل کلچرل ڈپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکاڈمی کے سکریٹری کے پاس پہنچی بے چارہ سکریٹری اسی وقت اپنی گاڑی میں سوار ہو کر سکریٹریٹ پہنچا اور دبے ہوئے آدمی سے انٹرویو لینے لگا ——— !

"تم شاعر ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں!" دبے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔

"کیا تخلص کرتے ہو؟"

"اوس!"

"اوس؟" سکریٹری زور سے چیخا ——— "کیا تم وہی اوس ہو، جس کا مجموعۂ کلام "اوس کے پھول" حال ہی میں شائع ہوا ہے!"

دبے ہوئے شاعر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم ہماری اکاڈمی کے ممبر ہو؟" سکریٹری نے پوچھا۔

"نہیں ——— !"

"حیرت ہے!" سکریٹری زور سے چیخا۔ "اتنا بڑا شاعر۔ 'اوس کے پھول' کا مصنف اور ہماری اکاڈمی کا ممبر نہیں ہے۔ اف اف ـــ! کیسی غلطی ہوگئی ہم سے، کتنا بڑا شاعر اور کیسے گوشۂ گمنامی میں دبا پڑا ہے۔"

"گمنامی میں نہیں، ایک درخت کے نیچے دبا پڑا ہوں۔ براہ کرم مجھے اس پیڑ کے نیچے سے نکالئے۔!"

"ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" سکریٹری فوراً بولا۔ اور فوراً جا کر اس نے اپنے محکمے میں رپورٹ کی۔

دوسرے دن سکریٹری بھاگا بھاگا شاعر کے پاس آیا اور بولا۔ "مبارک ہو۔ مٹھائی کھلاؤ۔ ہماری سرکاری اکاڈمی نے تمہیں اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر چن لیا ہے۔ یہ لو پروانہ انتخاب!"

"مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے تو نکالو!" دبے ہوئے آدمی نے کراہ کر کہا۔

اس کی سانس بڑی مشکل سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید تشنج اور کرب میں مبتلا ہے!

"یہ ہم نہیں کر سکتے!" سکریٹری نے کہا۔ "اور جو ہم کر سکتے تھے، وہ ہم نے کر دیا۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کر سکتے ہیں کہ اگر تم مرجاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دے سکتے ہیں۔ اگر تم درخواست دو تو ہم وہ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں ابھی زندہ ہوں۔" شاعر رک کر بولا۔ "مجھے زندہ رکھو!"

"مصیبت یہ ہے"، سرکاری ادبی اکاڈمی کا سکریٹری ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "کہ ہمارا محکمہ صرف کلچر سے متعلق ہے۔ درخت کاٹنے کا معاملہ قلم دوات سے نہیں آری کلہاڑی سے متعلق ہے۔ اس کے لئے ہم نے فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کو لکھ دیا ہے اور ارجنٹ لکھا ہے!"

شام کو مالی نے آکر دبے ہوئے آدمی کو بتایا۔ "کل فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی آکر اس درخت کو کاٹ دیں گے اور تمہاری جان بچ جائے گی۔"

مالی بہت خوش تھا۔ دبے ہوئے آدمی کی صحت جواب دے رہی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے لئے لڑے جا رہا تھا۔ کل تک، صبح تک...... کسی نہ کسی طرح اسے زندہ رہنا ہے!

دوسرے دن جب فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی آری کلہاڑی لے کر پہنچے۔ تو ان کو درخت کاٹنے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا۔ محکمہ خارجہ سے حکم آیا تھا کہ اس درخت کو نہ کاٹا جائے۔ وجہ یہ

تھی کہ اس درخت کو دس سال پہلے حکومت پیٹونیا کے وزیراعظم نے سکریٹریٹ کے لان میں لگایا تھا اب اگر یہ درخت کاٹا گیا تو اس امر کا شدید اندیشہ تھا کہ حکومت پیٹونیا سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لئے بگڑ جائیں گے۔!

"مگر ایک آدمی کی جان کا سوال ہے۔" ایک کلرک غصے سے چلایا۔

"دوسری طرف دو حکومتوں کے تعلقات کا سوال ہے۔" دوسرے کلرک نے پہلے کلرک کو سمجھایا "اور یہ بھی تو سوچو کہ حکومت پیٹونیا ہماری حکومت کو کتنی امداد دیتی ہے۔ کیا ہم ان کی دوستی کی خاطر ایک آدمی کی زندگی کو بھی قربان نہیں کرسکتے؟"

"شاعر کو مر جانا چاہئے۔"

"بلاشبہ!"

انڈر سکریٹری نے سپرنٹنڈنٹ کو بتایا۔ "آج صبح وزیراعظم دورے سے واپس آگئے ہیں۔ آج چار بجے محکمۂ خارجہ اس درخت کی فائل ان کے سامنے پیش کرے گا۔ جو وہ فیصلہ دیں گے وہ سب کو منظور ہوگا۔!"

شام کو پانچ بجے خود سپرنٹنڈنٹ شاعر کی فائل لے کر اس کے پاس آیا۔ "سنتے ہو؟" آتے ہی وہ خوشی سے فائل کو ہلاتے ہوئے چلایا۔ "وزیراعظم نے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ اس واقعہ کی ساری بین الاقوامی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ کل یہ درخت کاٹ دیا جائے گا اور تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرلوگے۔!"

"سنتے ہو؟ آج تمہاری فائل مکمل ہوگئی!" سپرنٹنڈنٹ نے شاعر کے بازو کو ہلا کر کہا۔

مگر شاعر کا ہاتھ سرد تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے جان اور چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار اس کے منہ میں جارہی تھی۔۔۔۔۔!

اس کی زندگی کی فائل بھی مکمل ہوچکی تھی۔!

کم پیداوار دینے والی دھرتی پر کام کرتا ہوا تھکا ہارا نڈھال انسان ــــ
ہاں، یہی بھارتی کسان کی تصویر ہے۔ سوکھے اور بارش کی تندی ترشی میں اُس کے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھے ہی رہتے ہیں۔



پلان کا اہم جزو ہے، زراعت کے ڈھانچے میں تبدیلی لانا۔ کیمیائی کھادوں سے دھرتی زرخیز بنتی ہے، جبکہ تحقیق کی بدولت بیجائی کے لئے بہتر بیج دستیاب ہوتے ہیں۔ آبپاشی کے پروجیکٹوں کے ذریعے برسات کی تندی ترشی اور جھاگ اُگلتے طوفانی دریاؤں پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اب زیادہ اراضی میں سینچائی یقینی ہو گئی ہے۔

زراعت ــــ ہماری معیشت ــــ کی بُنیاد

راجندر سنگھ بیدی

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(اعترافات)

پادری روزاریو نے گناہگار جاہن سے کہا — "تم تو
اعترافِ گناہ کے لئے میرے پاس آئے تھے۔ مگر تم نے ڈینگیں
مارنا شروع کر دیں۔۔۔!"

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ایک دن مجھے گناہگار کی صورت میں کھڑا ہونا پڑے گا اور اپنے وہ گناہ قبول کرنے پڑیں گے جو میں نے نہیں کئے۔ یا اگر کئے ہیں تو اس لئے کہ مجھے فن کی سند حاصل ہے جو ایک طرح سے راشٹرپتی کی معافی ہے جو سنگین سے سنگین قتل میں بھی سرکاری گواہ کو میسّر ہوتی ہے۔۔۔۔

باپ روزاریو! میں ایک سیدھا سادا، حلالی اور قانون پرست شہری تھا۔ اپنے پڑھنے والوں سے پیار، ان سے راہ کرتا تھا۔ انہیں چومتا چاٹتا تھا، حالانکہ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ سب کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا اور اگر کہیں ان کو پیرِ تسمہ پا کی طرح سے اپنے اوپر سوار ہوتے دیکھتا تو جھٹک بھی دیتا۔ میں ایک طرح کا جمینیز JIMENEZ تھا جو اپنا ہر دکھ سکھ اپنے پلاٹیرو PLATERO کو بتاتا ہے، جو ایک بڑا پیارا اور معصوم سا گدھا ہے اور جمینیز کی بدولت اب تک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا

ہے۔ آپ اس گدھے کو نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں۔ کیوں کہ اپنی خدمات کے عوض وہ جمینز کو نوبل پرائز بھی دِلوا چکا ہے۔

گدھے کے ذکر کا بُرا مت مانئے۔ فادر روزاریو! آپ تو جانتے ہیں، مغرب میں گدھے کو اتنا برا جانور نہیں سمجھا جاتا جتنا ہم اسے اپنے ہاں سمجھتے ہیں۔ پھر آپ تو گوا کے رہنے والے ہیں اور اب ہندستانی ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے، گدھے کی بیوقوفی ایک اسطوری بات MYTH نہیں جو ہم اور آپ ہی نے مل کر بنائی ہے؟ گدھے میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ــــ وہ بوجھ اٹھاتا ہے۔ ڈنڈا کھانے پر فقط رفتار تھوڑا تیز کر دیتا ہے، مگر شکایت کا حرف تک زبان پہ نہیں لاتا جو ایک کامیاب زندگی کا راز ہے اور جس کی تلقین ہمارے روحانی پیشوا کب سے کرتے آئے ہیں اور ہمارے نیتا اب تک کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے، باپ روزاریو! کیا میری بوجھل تحریر پڑھ کر میرے قاری مجھے مارنے دوڑتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ ایسا ہوتا تو میں روز صبح ان کو ماٹنگا میں پان والے کی دوکان اور دن کو کسی فلم اسٹوڈیو میں مل جاتا اور شام کو کہیں اسپتال میں اپنی پسلیاں گنتا۔ وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ مجھے سمجھ گئے ہیں اور میں ان کا راز پا گیا ہوں۔ قصہ مختصر، انہیں مجھے اور مجھے انہیں بیوقوف سمجھنے کی پوری آزادی تھی۔ جو آپ، ان حالات میں نہیں ہے جب کہ میں ــــ جاہن ــــ گناہِ اقبال ــــ معاف کیجئے۔ اقبالِ گناہ کے لئے آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور سر جیسے گھٹنے میں پڑا ہے۔ اگر میں بے باک طریقے سے اعتراف گناہ کرتا ہوں تو آپ کو وہ میری ڈینگیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور اگر دبی زبان سے مانتا ہوں تو حقیقت مونالزا کی مبہم سی مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے.... عجیب مصیبت ہے نا؟

فادر روزاریو! اعتراف گناہ کا مسئلہ میرے نزدیک بہت نازک ہے۔ میں ایک ایماندار آدمی ہوں اس لئے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ چاہے خدا حاضر ناظر ہو یا نہ ہو۔ میرا ہاتھ مقدس کتاب پر ہو یا نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لیجئے گا کہ میں خدا کو نہیں مانتا یا کسی مقدس کتاب پر ایمان نہیں لاتا۔ خدا پر ایمان نہ لانا تو اپنے پہ ایمان نہ لانے کے برابر ہے، فادر! کیونکہ ہمارا "آپ"

ہی خدا ہے اور کتاب بھی میری ہی طرح کے ایک انسان نے اپنے ارفع لمحوں میں لکھی ہے۔ میں ایسا ہی کافر ہوتا تو اس اعتراف کے سلسلے میں آپ، جو خدا کے نمائندے ہیں، کے پاس ہی کیوں آتا؟ آپ بے صبر ہو رہے ہیں؟ ― یہ نوڈیٹنگ نہیں ہے۔ بہرکیف، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گناہ پہلے ہوتا ہے اور اعتراف بعد میں۔ لیکن میں اپنا کیا کروں؟ میں ان گناہگاروں کی قبیل میں سے ہوں جو اعتراف پہلے کرتے ہیں اور جب کوئی ان کے اعتراف کو اہمیت نہ دے یا انکی طرف نہ دیکھتا ہو تو چپکے سے ایک طرف جا کر کہانی لکھ مارتے ہیں۔

پہلے میں اپنی کہانی کے کرداروں اور اس کے تانے بانے کو اپنے دوستوں پر آزماتا ہوں، باپ روزاریو! مگر ساتھ ہی یہ صریح جھوٹ بول دیتا ہوں کہ میں اسے لکھ بھی چکا ہوں۔ اس جھوٹ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی حرام الدہر اسے چرا نہیں پاتا اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنی کہانی کے اثر کا پتہ چل جاتا ہے۔ اگر وہ بہت ہی متاثر معلوم ہوں اور خوب ہی سر دھنیں تو میں اس کہانی کو سرے سے لکھتا ہی نہیں۔ ہاں، ایسی کہانی لکھنے کا فائدہ ہی کیا، فادر، جسے کھوٹتے ہی ہر نتھو خیرا سمجھ جائے۔ اگر ان کے چہروں پہ ناسمجھی کے نقوش دیکھتا ہوں تو مجھے یقین آجاتا ہے کہ میاں، اب بات بنی۔ تب میں اسی وقت لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ کہانی ہوتی بھی بے حد کامیاب ہے کیونکہ وہ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی، جو کہ میرے نزدیک فن کی معراج ہے۔ دیکھئے تو، دنیا بھر کا آرٹ، کیا ناول اور کیا مصوری اور کیا تعمیر، سب کدھر جا رہے ہیں؟ اور ہم ابھی تک مطلب کے چکر میں پڑے ہیں۔ میں مطلب کی پروا نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد میں۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں۔ ناسمجھی کے الزام سے ڈرتے ہوئے وہ خود ہی اس میں معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب میں بے اختیار ان کی داد دیتا ہوں اور ان کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہہ اٹھتا ہوں ―― بالکل میرا ہی مطلب تھا۔ مگر افسوس ذہانت کے اس ویران آباد، ملک ہندوستان میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہیں؟ ... در اصل کہانی ہر ایک کے لئے لکھی بھی نہیں جاتی، یارو، میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی بھی سمجھ گیا تو میری محنت ٹھکانے لگی ..... جتھو.....

کیا میں پھر ڈینگیں مار رہا ہوں فادر؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اعتراف پہلے کرتا ہوں اور گناہ بعد میں۔ اعتراف پہلے ہو یا گناہ لیکن ایک بات طے ہے اعتراف و گناہ دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں اور بیکار ہی آپس میں الجھتے رہتے ہیں۔ میں انہیں علیحدہ علیحدہ لے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن دونوں برابر اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی ہی ایک کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک آدمی کسی مرد عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ کیا مرد اور عورت کے جھگڑے کا کوئی حل ہے؟ باپ روز اریو کبھی ہوا ہے یا ہوگا؟ —— ایک مارنے والا اور دوسرا مار کھانے والا۔ ایک اذیت دینے والا دوسرا اذیت سہنے والا۔ اور دونوں اسی طرح سے خوش رہتے ہیں۔ ہم بیچ میں مامون ہوتے ہیں؟ البتہ مرد و عورت کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اپنا رول ٹل بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ ہر مرد میں ایک عورت چھپی ہوتی ہے اور ہر عورت میں —— کئی مرد کم از کم بھر تری ہری تو اپنے شرنگار شتک میں کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں۔ بہرحال ان کے فضیحتے کے بارے میں ازل سے کہانیاں لکھی جا رہی ہیں اور ابد تک لکھی جائیں گی، جن میں جھگڑا، مار پیٹ ایذا رسانی ایک ضمنی اور مقامی حیثیت رکھیں گے۔ اور ہم تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی ساری رہبانیت اور اپنے تجرد کے فلسفے میں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے، جس کی نفی میں ہم اپنے بدن کے پھوڑے کو برفاب میں ڈبوتے، درختوں پہ الٹا لٹکتے اور اذیت دینے والے فاقے کرتے ہیں؟ بوکاشیو کی داستانوں میں کتنے مردوں اور کتنی عورتوں نے اعترافِ گناہ کیا اور پھر اپنی پہلی ہی فرصت میں گناہ کی طرف لوٹ آئے، کیونکہ وہ سانپ کی کھال کی طرح سے ڈراؤنا ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں کوئی ایبٹ اور فرائڈ جو خود کو خدا کا اور کلیسا کا نمائندہ کہتا تھا، بیوقوف بن گیا۔ کیا وقت نہیں آیا، فادر کہ ایبٹ اور فرائڈ، ملا اور قاضی، پنڈت اور پجاری لوگ بیوقوف بنانا چھوڑ دیں؟ میری بات چھوڑ دیجیے میں اس وقت سچے دل سے اعتراف کر رہا ہوں اور بہت سے لوگوں کی طرح کنفیشن کے کان کاٹ کر اسے فیشن کے طور پر استعمال نہیں کر رہا۔ ہاں بعد میں کیا ہوتا ہے، یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ

سوائے اس حسین ابہام کے جو ہمارا خدا ہے اور کون جان سکتا ہے؟..... تو میں کہہ رہا تھا کہ میری کہانی میں وہ آدمی مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ جس طریقے سے میں اعتراف اور گناہ کو الگ الگ اور منفرد حیثیت دیتا ہوں اسی طرح اس نے دونوں کو الگ الگ سمجھانے کی کوشش کی۔ پہلے وہ مرد کو ایک طرف لے گیا اور بڑے جوکھم کے ساتھ اسے سمجھایا بجھایا اور اس کے خون آشام غصے کو ٹھنڈا کیا۔ پھر وہ عورت کو الگ، ایک طرف لے گیا مگر آج تک واپس ہی نہیں آیا۔۔۔

ہیں، فادر روزاریو؟!!

میرے لکھنے لکھانے کی ابتدا چوری سے ہوئی، باپ روزاریو! آپ گھبرائیے نہیں۔ ذرا صبر سے میری بات سنئے۔ میں کہیں بھی اس چوری کے سلسلے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں ٹھہراؤں گا۔ آپ کے اٹھے ہوئے ابرو اور چہرے کے سوالیہ نشان مجھے پریشان کر رہے ہیں اس لئے بعد کی بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دوں تاکہ آپ کو اپنے وجود سے بھی تسلی رہے۔ میں نے چوری کی اور پھر خود ہی اپنے منہ پر دو تین چپتیں بھی ماریں۔ کیونکہ اس کام کے لئے اور کوئی پاس نہیں تھا۔ جیسا کہ ہر کامیاب چوری میں وہ نہیں ہوتا، نہ معلوم کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ کئی لوگوں میں صبر نہیں ہوتا۔ ادھر چوری ہوتی ہے ادھر وہ چلاّنا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں پہلے دور بھاگتے ہیں اور جب دوسرے مدد کے لئے آجائیں تو پھر قریب آجاتے ہیں۔ اور پکڑ لیتے ہیں آپ چاہے کتنی بھی معافی مانگیں مگر وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی سرشت میں کتنا ظلم کتنی ناانصافی ہے کہ چوری بھی آپ ہی کو کرنی پڑے اور معافی بھی آپ ہی مانگیں۔

قصہ یوں ہوا فادر، کہ ہمارے کالج کے ایک پروفیسر اکولا میں سب جج ہو گئے۔ کامیابی کا دروازہ ان پر کسی پاگل کے قہقہے کی طرح سے کھل گیا۔ اب ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کریں چنانچہ ہم لڑکوں کو جو کہ بکھرے ہوئے تھے اکٹھا کیا اور ایک لکچر دینا شروع کر دیا۔ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا باپ روزاریو، کہ کامیابی کے دروازے پر کھڑا آدمی اس کے اندر کیوں نہیں جاتا؟ باہر ہی سے لیکچر دینا کیوں شروع کر دیتا ہے؟ شاید اس لئے کہ اندر جاتے ہی اسے کامیابی کی اساس کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر دوسرے لیکچر دیتے ہیں اور وہ غریب کان بند کرنے کی کوشش میں منہ کھول

کر سکتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے کہا۔ اس دنیا میں معمولی (MEDISERE) قسم کے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تم چاہے چور بنو، لیکن اس پائے کے چور کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا تمہاری ہمسری نہ کر سکے......

اب اس عمر میں ہمیں کیا معلوم، قادر روزار یو؟ ہمارے نزدیک تو چور کا ایک لفظ تھا جو کُل روئے زمین پر گھوم کر پھر ہمارے کانوں میں چلا آتا تھا۔ ایک بچہ کیا جان پائے کہ پروفیسر کی زبان میں وہ ایک اصطلاحی لفظ تھا، جس مطلب پردھان منتری بھی ہو سکتا ہے، انجینئر ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ ہم اس نئی تعلیم کو پروفیسر صاحب ہی سے شروع کرتے لیکن وہ تین ڈاؤن کلکتہ میل سے جا چکے تھے۔ ہمیں خاص بننے کا سبق دینے ہی خود ہمیشہ کے لئے عام ہو گئے تھے۔ پھر ہم نو آموزوں کے سامنے کوئی ایسی زندہ مثال بھی تو نہ تھی۔ ہندستان کے پھوہٹ اور امریکہ کے ال کپون جنکی زمانے بھر نے عزت کی ہے، عرشۂ تاریخ پر بہت لیٹ آئے تھے۔

نوجوان ہونے کی وجہ سے مجھ میں بلا کا جوش تھا، فادر، جو کسی صبر کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ میں تو راتوں رات کسب کمال کرنا اور اپنا گھوڑا وہاں، اوپر کہکشاں پر دوڑانا چاہتا تھا لیکن میرے پاس باگ کے پیسے تھے اور نہ رکاب کے دام۔ غالباً اسی لئے میں نے اسے یو نہی چلنے دیا۔ میں نے چھوٹتے ہی چوری نہیں کی، باپ روزار یو، میں جانتا تھا کہ قید ہو جانا برا سا لگتا ہے۔ پروفیسر صاحب سے کہیں پہلے ماں باپ مجھے لمبے چوڑے لیکچر دے چکے تھے اور ریپیٹ بھی چکے تھے۔ لیکن پروفیسر زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا، اس لئے اس کی بات دل کو لگتی تھی۔ چنانچہ دنیا کے ہر چور کی طرح، سرسری طور پر اپنے ضمیر کی تسلی کے لئے پہلے میں نے شرافت کے سب گر استعمال کئے۔ میری آواز اچھی تھی، اس لئے میں سنگیت سیکھنے کی غرض سے راوی روڈ لاہور کے گاندھرو مہاودیالیہ کی سب سے آخری بٹالین میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن میرا جذبہ تھا کہ سات سروں کی قید میں نہ آتا تھا اور آٹھویں کی اجازت نہ تھی۔ میرا گانا نوٹیشن میں آکر گانہ، گانہ پڑھا جاتا تھا۔ میں نے ایک دو تمغے مارے لیکن استاد بوٹے خاں پچھی ہٹہ والے اور امرتسر کے چوتھ رام کی مجلسوں میں جاتے ہی پتہ چل گیا کہ میرے سامنے تو برسوں کے ریاض کی دیوار کھڑی ہے اور آسمان سے باتیں کر رہی

ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ اور نوکِ زبان سے اسے ہموار کرنا ہوگا۔ چنانچہ میں یوں الگ ہوگیا
جیسے کہ کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی فوراً اٹھ کر تھوڑا ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر اپنی پگڑی
سنبھالتا، منہ میں کچھ منمناتا ہوا اس منظر سے ٹل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ انٹی امپیریلسٹ
"جنگ" کا زمانہ تھا جس میں ہمارے لیڈر ہمیں سوت کے گولوں سے لڑنے کا مشورہ دیتے تھے
اور کہتے تھے کہ مار کھا کھا کر انگریز کو سور بنا دو۔ مار ہی کھانی ہوتی، فادر، تو میں شروع ہی
سے پروفیسر کی بات پر عمل کیوں نہ کرتا جب ہم پٹاخہ قسم کے لیڈر کی نوکری خالی تھی۔ کچھ لڑکوں کے
ساتھ مل کر میں نے ایک کمشنر پر بم بنانے کی کوشش کی۔ انگریز گورنر مونٹ مورنسی تو جوں کا توں
سلامت رہا لیکن میرے ایک ساتھی کا ہاتھ اڑ گیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے، باپ روزاریو جس
سے بعد میں میں نے کہانیاں لکھیں اور اب اسے آپ کے ہاتھ پر رکھے ہوئے ان گناہوں کا
اعتراف کر رہا ہوں۔

چوری کی بات میں الگ نہیں رہا، باپ روزاریو! میں کہانی لکھنے والا ہوں، اس لئے
اسے عین موقع پہ، فنی انداز میں کہوں گا۔ یعنی اس وقت جبکہ آپ کا تجسّس پانی نہ مانگے۔ میں نے
اور بھی بہت سے پاپڑ بیلے۔ پاپڑوں میں دال کے ساتھ کالی مرچ بھی پڑتی ہے۔ لیکن مجھے اب تک
صرف آٹے دال ہی کا بھاؤ معلوم ہوا تھا۔ میں نے فنِ مصوری میں نکل جانے کی کوشش کی اور
میں واقعی نکل بھی گیا۔ ہوا یہ کہ لینڈ اسکیپ بنانے کی بجائے میں انسانی پیکر پہ ہاتھ صاف کرنے لگا
اور غلطی سے وہ بھی عورت کے پیکر پر۔ اسے بنانے میں میں خود ہی اس پہ عاشق ہو گیا۔ اتنے مہنگے
آرٹ پیپر کو ایک طرف چھوڑ کر میں زندگی میں اسے ڈھونڈنے کے لئے چل نکلا جس کاغذ پر میں نے
اسے بنایا تھا وہ تو اب تک گلایا، کوٹا اور پھر سے کاغذ بنایا جا چکا ہے لیکن میں اب تک اسے
ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے بدن پر کے اس خط کی تحقیق شروع کر دی جو عورت کو مرد سے ممیز کرتا
ہے اور اس کے دماغ میں بے پناہ فتور پیدا کر دیتا ہے۔ دیکھئے نا ایک معمولی خم سے کیا سے کیا
ہو جاتا ہے۔ پھر عورت کے بدن میں کمر سے نیچے رانوں کی طرف جو خط جاتا ہے وہاں ایک ہلکا سا
بے بضاعت گڑھا پڑتا ہے، جسے انسانی جسم کے تشریحی علم والے صرف رگوں اور پٹھوں کا

اتار چڑھاؤ سمجھتے ہیں۔ نامعلوم کیسے گویا نے اپنی مشہور پینٹنگ "ماجادی نیور ا ہیں" اسے نظر انداز کر دیا؛ حالانکہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ لکھ سکتا ہوں۔ دراصل اس قسم کی باتیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایمرسن نے لکھا ہے کہ وہ سامنے کا کھیت جس کے پیچھے سورج غروب ہوتا ہے، مسٹر لاک کا ہے۔ لیکن نہیں وہ دراصل شاعر کی ملکیت ہے۔.......

میں شاعر ہو گیا۔ انگریزی کے ہیروئیک میٹر میں نظمیں لکھیں جو چھپیں بھی۔ لیکن چھپنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارے کئی شاعر دوستوں کی نظمیں چھپتی رہتی ہیں، چاہے ان کا ایک مصرع بھی آپ یاد نہ رکھ سکیں۔ ایک نابالغ ذہن کا مالک تتبع، محض تتبع میں بعض وقت اچھی چیز لکھ مرتا ہے۔ انگریزی ادب کے گریسے نے طفلی میں بڑا عمدہ نوحہ نہیں لکھا؟ پھر میں نے انگریزی میں لکھنا چھوڑ دیا۔ ہاں، ہندستان میں رہنا اور ہندستانیوں سے بیر اچھا نہ معلوم ہوا۔ جب اردو کا رواج تھا اور اردو میں لکھنے والے اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ جیسے اب ہندی والے سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو روپ کہتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی اور اس کے علم و عروض —— معقولن نامعقولن سے ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونو بے ہوش پڑے تھے۔ یعنی کہ میں اور شعر۔ کہیں راستہ نہ پاکر میں چھوٹا سا "سینٹ جینے" ہو گیا۔

سینٹ جینے کو آپ نہیں جانتے، باپ روزاریو! وہ آپ کی طرح کا سینٹ نہیں۔ وہ چور، گرہ کٹ، فاسق و فاجر ہے۔ عونیں تو ایک طرف، اس نے لونڈوں میں بھی دلچسپی لی ہے جو کہ میں نے نہیں لی۔ اس کے باوجود سارتر نے مقدس باپ پوپ کے فرائض خود پہ لے کر اسے معبود DEITY کر دیا۔ ہر جگہ روک، ہر راستے کو سنگ لاخ پاکر میرے بے پناہ جذبوں نے نکاس کے اور بھی بہت سے راستے ڈھونڈ لئے، جن کا تعلق کسی بھی تعمیری چیز سے نہ تھا۔ میں نے اندھیروں کی پناہ لی۔ اندھیرے کی بابت آپ نہیں جانتے فادر۔ پہلے خیرہ کر دینے والی روشنیوں کے بعد ایک لق و دق اندھیرا آتا ہے اور پھر ایک نرم سی مسلسل اور مقدس روشنی جس کا شروع ہے اور نہ آخر اور جس کے پرتو سے پوری کائنات چلتی اور سانس

لیتی ہے۔ لیکن اندھیرا، اندھیرے کے جادو کا میں آپ کو کیا بتاؤں، باپ روزاریو، کیونکہ وہ آپ کے تنگ و تاریک حجروں میں نہیں ہوتا۔ تاریکی کے باوجود وہاں تجلی رہتی ہے لیکن اپنی تاریکی خالص تاریکی ہے۔ آپ کے ہاں کا اندھیرا اجالے سے متبادل MUTATE ہوتا رہتا ہے لیکن اپنے ہاں اندھیرے کی کوئی جگہ لیتا ہے تو اندھیرا جیسے ایک صفر کو لاکھوں صفروں سے ضرب دیجئے تو نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ اس اتھاہ اندھیرے میں عقل نہیں وجدان کام آتا ہے اس میں کروڑوں اربوں دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جذبات اور ارمانوں کے چھوٹے چھوٹے پتنے اور بڑے بڑے شہ پر اڑتے ہیں۔ وہ آنکھوں سے نہیں اپنی پرواز سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ کی مدد سے اپنے سامنے روک پا کر لوٹ آتے ہیں لیکن ان کی پرواز کسی طرح سے کم نہیں ہوتی۔ ان کی بصیرت کے ہاتھ پر لاکھوں آنکھیں امڈ آتی ہیں، جن سے وہ راستہ ٹٹولتے اور پاتے ہیں۔ جس دن میں اندھیرے کی تلاش میں نکلا اس دن ہمارے ایک بہت بڑے روحانی پیشوا کا جنم دن تھا جس کی پوری امت ایک طرف خوشیاں منا رہی تھی اور دوسری طرف مصروفِ عبادت تھی۔ جب ایک طرف میرے پورے بدن پر ڈر سے لرزہ چھا رہا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی خوش آئند سنسناہٹ رگ و پے میں سما رہی تھی، چونکہ گناہ ثواب کا مقابل ہے، فادر، اس لئے انسانی جسم و ذہن گناہ سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں جتنی کہ ثواب کی بے حرمتی ہو۔ آہ، مگر کتنی دیر کوئی اندھیرے میں رہ سکتا ہے؟ کتنی دیر اجالے میں رہ سکتا ہے؟......

کسی حکیم نے کہا ہے کہ وہ شخص جو اپنی منزل کو نہ پا سکے، اس آدمی سے زیادہ بے حیائی کی زندگی گزارتا ہے جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ سچ مچ ایک تخلیقی ذہن کا مالک جب تخلیق نہیں کر پاتا تو وہ ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ اس انداز میں گرتا اور رگڑتا چلا جاتا ہے کہ اس کا ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے تاوقتیکہ کہیں کوئی نغمہ نہ سنائی دے جائے پھر وہ معصیت کی گود میں جانے کی بجائے اس کے پیروں پہ لوٹتا ہے جس سے معصیت بھی موکش پا لیتی ہے...... یہ سب کچھ سلیقے سے ایک شعر نہ لکھ سکنے کی بدولت ہوا، فادر روزاریو!

میں نے اتنے گناہ کئے کہ میں انہیں گن بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ضمیر اپنا غرور رکھتا تھا اور بدن اپنا۔ ضمیر ایک حسین عورت کی طرح خود اعتماد ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ذرا بھی تو کوئی دوسری خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہی شرط پر محبت کا قائل ہوتا ہے جو اکثر مان لی جاتی ہے بلکہ ماننا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ خوبصورت عورت یاد آتی ہے، جس نے اپنے زعم حسن میں ایک فلم ڈائرکٹر کو جس نے بیشمار شادیاں کی تھیں، شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور کہا —— یاد ہے، میاں ایک بار تم نے شادی کی فرمائش کی تھی ؟ ڈائرکٹر نے اسے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں ٹوک کر کہا —— تب ؟ ..... میں نے کی تھی ؟

جس رات میں نے چوری کی اس رات ہر چیز چوری ہو جانے کے لئے آمادہ ہو رہی تھی۔ شام کے وقت عام طور پر سورج آہستہ آہستہ غروب ہوتا ہے۔ اس کے غروب ہو جانے کے عرصہ بعد تک بھی ایک روشنی سی رہتی ہے جو دھیرے دھیرے اندھیرے کو جگہ دیتی ہے لیکن اس دن عجیب بات ہوئی۔ ایک لمحے نے زمان و مکان کی قید کو توڑ دیا اور اکائی بن کر میرے سامنے ساکت ہو گیا۔ اس سے فوراً پہلے آسمان پر جون کی دوپہر کا سورج تھا اور فوراً بعد دسمبر کی اماوس۔ یہ کہ کوئی ہزار واٹ کے ہنڈے کو آنِ واحد میں گل کر دے، قدرت میں بھی ہوتا ہے جب لاکھوں سر پٹخنے پر بھی مجھ سے ایک مصرع موزوں نہ ہوا تو میں نے ایک پرانا سا رسالہ اٹھا کر اس میں سے احتیاطاً ایک گمنام شاعر کی غزل چرائی اور اپنے نام سے چھپنے کے لئے اخبار میں بھیج دی۔ اخبار والے تو آپ جانتے ہی ہیں، ہر اچھی چیز کو چھاپنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے لئے کوئی پیسے نہ مانگے۔ ہاں، کیوں کہ ایڈیٹر اور اس کا پورا خاندان بھی ہر ہفتے اخبار کو اپنی طبع زاد چیزوں سے نہیں بھر سکتے۔ غزل چھپ کر آئی۔ اس پر میرا نام تھا جو چھپا ہوا تھا۔ میں اسے دن میں پچیس تیس بار پڑھتا تھا اور بازار کی طرف نکل جاتا تھا تاکہ لوگ میری طرف دیکھیں۔ جب تک، کہیں اندر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ غزل میری اپنی ہے، لیکن .....

ہمارے گھر میں ایک شاعر مہمان رہتے تھے۔ انہوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر میری غزل

کی طرف اور کچھ یوں داد دی کہ اسی پرچے میں 'دزدِ سخن' کے عنوان سے میرے خلاف ایک دو کالمہ مضمون چھپا، جس میں چوری کا ماخذ بھی درج تھا۔ اب میں باز ار بھی نہ جا سکتا تھا۔ ۔ ۔

چوری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے، باپ روزاریو! چوری ...... خیر ہٹائیے۔ میں دنیا بھر کی گھٹیا باتوں کے جواز میں فلسفے پیدا کر کے آپ کو بور نہ کروں گا۔ ہاں، یہ تو ہر لکھنے والے کے دائیں ہاتھ کا کام ہے یا شاید بائیں کا۔ کیونکہ بہت کم ایسے کام ہیں جن کے لئے دونوں ہاتھ استعمال کرنا پڑیں۔ بہرحال ایک بات طے ہے کہ ایک چوری دوسری چوری ضرور کرواتی ہے۔ جیسے ایک بدن کو چھپانے کے لئے دوسرا بدن ڈھونڈنا پڑتا ہے، ایک جھوٹ دوسرا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن میری وہ دوسری چوری، پہلی چوری سے مختلف تھی۔ میرے دماغ کی انوکھی منطق نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں شعر نہیں لکھ سکتا تو میرا مہمان شاعر بھی نہیں لکھ سکتا کیوں کہ اس کی شکل میری شکل سے بھی زیادہ دافعِ شعر تھی۔ وہ پلاٹیرو تھا۔ ایسا پلاٹیرو جو معصوم بھی نہ لگ سکے۔ وہ اس الو کی طرح تھا، فادر! جو کاٹھ کا بھی نہیں بلکہ اصلی ہو اور جسے آپ عبادت کے لئے جاتے ہوئے آناً فاناً کہیں ببول پر بیٹھا ہوا دیکھ لیں اور جس سے آپ ڈر جائیں اور وہ بھی۔ مجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ بھی شعر چوری کرتے ہوں گے؟ بڑے آسان طریقے سے جب وہ اپنا شیو بناتے تھے تو ٹھوڑی پہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں بالوں کا ایک ٹھنٹھ رہ جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔

'دزدِ سخن' والی رات میں وہ اور میرے چھوٹے بھائی نے ان کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے صرف ان کی چوری کے ماخذات نکالے، حالانکہ اس میں پیسے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہندو سبھا کالج امرتسر سے ایک رسالہ نکلتا تھا جس کا نام 'شوالہ' تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چوریاں یا ریاں سب شوالوں میں ہی ہوتی ہیں۔

ان کی چوری پکڑ کر جیسے مجھے سکون قلب حاصل ہو گیا، جیسے میرے سب گناہ دھل گئے۔ پہلی چوری اور بعد کی گرفتاری کا لرزہ ابھی تک بدن میں باقی تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ برا لکھوں گا لیکن اپنا برا۔ کسی کا برا لکھنے سے کیا فائدہ؟

دیکھا، باپ روزاریو! بعض وقت کتنی اچھی چیز کی ابتداء کتنی گندی چیز سے ہوتی ہے۔

میں نے اتنے گناہ کئے کہ میں انہیں گن بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ضمیر اپنا غرور رکھتا تھا اور بدن اپنا۔ ضمیر ایک حسین عورت کی طرح خود اعتماد ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ذرا بھی تو کوئی دوسری خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہی شرط پر محبت کا قائل ہوتا ہے جو اکثر مان لی جاتی ہے بلکہ ماننا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ خوبصورت عورت یاد آتی ہے، جس نے اپنے زعم حسن میں ایک فلم ڈائرکٹر کو جس نے بیشمار شادیاں کی تھیں، شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور کہا —— یاد ہے، میاں ایک بار تم نے شادی کی فرمائش کی تھی؟ ڈائرکٹر نے اسے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں ٹوک کر کہا —— تب؟ ..... میں نے کی تھی؟

جس رات میں نے چوری کی اس رات ہر چیز چوری ہو جانے کے لئے آمادہ ہو سکتی تھی۔ شام کے وقت عام طور پر سورج آہستہ آہستہ غروب ہوتا ہے۔ اس کے غروب ہو جانے کے عرصہ بعد تک بھی ایک روشنی سی رہتی ہے جو دھیرے دھیرے اندھیرے کو جگہ دیتی ہے لیکن اس دن عجیب بات ہوئی۔ ایک لمحے نے زمان و مکان کی قید کو توڑ دیا اور اکائی بن کر میرے سامنے ساکت ہو گیا۔ اس سے فوراً پہلے آسمان پر جون کی دوپہر کا سورج تھا اور فوراً بعد دسمبر کی اماوس۔ یہ کہ کوئی ہزار واٹ کے ہنڈے کو آنِ واحد میں گل کر دے، قدرت میں بھی ہوتا ہے۔ جب لاکھوں سر پٹخنے پر بھی مجھ سے ایک مصرع موزوں نہ ہوا تو میں نے ایک پرانا سا رسالہ اٹھا کر اس میں سے احتیاطاً ایک گمنام شاعر کی غزل چرائی اور اپنے نام سے چھپنے کے لئے اخبار میں بھیج دی۔ اخبار والے تو آپ جانتے ہی ہیں، ہر اچھی چیز کو چھاپنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے لئے کوئی پیسہ نہ مانگے۔ ہاں، کیوں کہ ایڈیٹر اور اس کا پورا خاندان بھی ہر ہفتے اخبار کو اپنی طبع زاد چیزوں سے نہیں بھر سکتے۔ غزل چھپ کر آئی۔ اس پر میرا نام تھا جو چھپا ہوا تھا۔ میں اسے دن میں پچیس تیس بار پڑھتا تھا اور بازار کی طرف نکل جاتا تھا تاکہ لوگ میری طرف دیکھیں۔ جب تک، کہیں اندر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ غزل میری اپنی ہے، لیکن .....

ہمارے گھر میں ایک شاعر مہمان رہتے تھے۔ انہوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر میری غزل

کی طرف اور کچھ یوں داد دی کہ اسی پرچے میں 'دزدِ سخن' کے عنوان سے میرے خلاف ایک دو کالمہ مضمون چھپا، جس میں چوری کا ماخذ بھی درج تھا۔ اب میں باز ا ربھی نہ جا سکتا تھا۔۔۔

چوری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے، باپ روزاریو! چوری ...... خیر ہٹائیے۔ میں دنیا بھر کی گھٹیا باتوں کے جواز میں فلسفے پیدا کر کے آپ کو بور نہ کروں گا۔ ہاں، یہ تو ہر لکھنے والے کے دائیں ہاتھ کا کام ہے یا شاید بائیں کا۔ کیونکہ بہت کم ایسے کام ہیں جن کے لئے دونوں ہاتھ استعمال کرنا پڑیں۔ بہر حال ایک بات طے ہے کہ ایک چوری دوسری چوری ضرور کرواتی ہے۔ جیسے ایک بدن کو چھپانے کے لئے دوسرا بدن ڈھونڈنا پڑتا ہے، ایک جھوٹ دوسرا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن میری وہ دوسری چوری، پہلی چوری سے مختلف تھی۔ میرے دماغ کی انوکھی منطق نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں شعر نہیں لکھ سکتا تو میرا مہمان شاعر بھی نہیں لکھ سکتا کیوں کہ اس کی شکل میری شکل سے بھی زیادہ دافعِ شعر تھی۔ وہ پلاٹیرو تھا۔ ایسا پلاٹیرو جو معصوم بھی نہ لگ سکے۔ وہ اس الو کی طرح تھا، فادر! جو کاٹھ کا بھی نہیں بلکہ اصلی ہو اور جسے آپ عبادت کے لئے جاتے ہوئے آناً فاناً کہیں ببول پر بیٹھا ہوا دیکھ لیں اور جس سے آپ ڈر جائیں اور وہ بھی۔ مجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ بھی شعر چوری کرتے ہوں گے؟ بڑے آسان طریقے سے جب وہ اپنا شیو بناتے تھے تو ٹھوڑی پہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں بالوں کا ایک ٹھنٹھ رہ جاتا تھا.....

'دزدِ سخن' والی رات میں وہ اور میرے چھوٹے بھائی نے ان کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے صرف ان کی چوری کے ماخذات نکالے، حالانکہ اس میں پیسے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہندو سبھا کالج امرتسر سے ایک رسالہ نکلتا تھا جس کا نام 'شوالہ' تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چوریاں یا ریاں سب شوالوں میں ہی ہوتی ہیں۔

ان کی چوری پکڑ کر جیسے مجھے سکونِ قلب حاصل ہو گیا، جیسے میرے سب گناہ دھل گئے۔ پہلی چوری اور بعد کی گرفتاری کا لرزہ ابھی تک بدن میں باقی تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ برا لکھوں گا لیکن اپنا برا۔ کسی کا برا لکھنے سے کیا فائدہ؟

دیکھا، باپ روزاریو! بعض وقت کتنی اچھی چیز کی ابتداء کتنی گندی چیز سے ہوتی ہے۔

خود انسان ہی کو دیکھئے، کیسے غلاظت میں لپٹا چلا آتا ہے اور پھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ سوائے کلیسا اور دوسرے مذاہب کی دیو مالاؤں کے چند کرداروں کے، سب اسی طرح سے آئے اور کیا کچھ نہ بن گئے۔ ان کرداروں کی بھی محیرّ العقول پیدائش کو عقل اور عقلِ محض کی لونڈی سائنس باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں تو کروں گا۔ بلکہ میں، جو کہانیاں لکھتا ہوں اور جس نے اپنے پچھلے جنموں میں اپنے وجود سے بے شمار دیو مالائیں لکھی ہیں، انسان کو ایسے ایسے طریقوں سے پیدا کروں گا کہ خود میری دیو مالائیں دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف دیکھیں کیونکہ میرے نزدیک اس قسم کی عجیب الخلقت پیدائشوں میں بہت بڑا سچ ہے جسے میں جھوٹ سچ کہتا ہوں اور جس بات کو میں جھوٹ سمجھتا ہوں، فادر روزاریو! اسے میں سچ جھوٹ کہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ کوئی چیز ثابت و سالم نہیں، اور نہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے، سوائے اس خدا یا سَو سَوا سَو عناصر کے جو مرکب ہونے کیلئے تڑپتے رہتے ہیں۔ سونا ان میں سے ایک ہے، مگر اس کی حقیقت بھی اس وقت بنتی ہے جب وہ میری معشوقہ کے گلے کی زینت ہو۔ اگر اکائی سب کچھ ہوتی باپ روزاریو! تو پرماتما جو پرُش ہے، مزے سے اکیلا رہتا۔ کیوں اس نے اپنے لئے پرکرتی پیدا کرلی؟ کیوں ہر چیز کو نامکمل رکھا اور مرکب ہو جانے پہ مجبور کر دیا؟ کیا اس لئے کہ موت میں بکھر جانے کا فن سیکھے؟ واہ کیا فن ہے! وہ جذبہ جونر کو دیا، اس کا کچھ حصّہ مادہ کو بھی کیوں دے دیا؟ —— میں بتاتا ہوں، کیوں؟ اس لئے کہ ہر چیز تکمیل کے لئے تڑپتی رہے اور اچھی اچھی کہانیاں پیدا ہوں، شعر کہے جائیں، تصویریں بنیں اور تانیں اڑیں۔ اکائی کوئی چیز نہیں، فادر! وہ صرف حساب کے کام آتی ہے اور اس سے پرے ہو کے بے معنی اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے روزمرہ میں کوئی دھڑے سے کہہ ڈالتا ہے کہ ترلوچن کو پارو سے محبت ہو گئی۔ ٹھیک ہے، ہو گئی۔ مگر ترلوچن تین یا تیسری آنکھ رکھنے کے باوجود کیوں پارو پہ قبضہ کرنا، اس سے شادی رچانا چاہتا ہے؟ کیوں اس پہ جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا اس لئے کہ وہ حسن کی تاب نہیں لا سکتا یا پارو خود ہی مقبوض و تاراج ہونا چاہتی ہے؟ چونکہ دونوں ہی باتیں صحیح ہیں اس لئے میں جو، ان کی محبت کو آنے والی نسلوں اور کہانی کی خاطر تسلیم کرتا ہوں، نفرت محبت کہوں گا۔ جو ترکیب میں نے ڈی ایچ لارنس سے لی ہے۔ اسی طرح

کسی اوباش کی ایک دوشیزہ سے محبت کو نفرت، ان کے رشتے کو انبساط و درد کا رشتہ......
ایسے ہی بلند و پست، اندھیرا اجالا وغیرہ..... بہر کیف میں اپنی اس چوری کو اسی صورت میں
سراہوں گا، فادر! اگر آپ میری کہانیوں کو اچھا سمجھتے ہوں تو، ورنہ منزل اور اس تک پہنچنے کے
ذرائع وغیرہ کے فلسفے کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ افسوس! آپ نے تو میری ایک بھی کہانی نہیں
پڑھی۔ ایکا ایکی میری چار اچھی کہانیوں کے نام مت پوچھیئے گا، پلیٹیرو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ، فادر!
کیونکہ ایکا ایکی پوچھ لینے سے تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ میں نے اچھی کہانیاں لکھی ہیں جن میں
سے ایک تو بائیبل کی سیمسن اور دلائیلا سے ٹکر لیتی ہے۔ اچھا، میری کہانی نہیں پڑھی تو کرشن چندر
کی 'کنواری' پڑھی ہے؟ مجھے وہ بہت پسند ہے۔ واقعی جنسی جذبہ انسان میں نہیں مرتا۔ چاہے وہ
کتنا ہی بوڑھا اور بیکار کیوں نہ ہو جائے۔ جنسی جذبے کا براہ راست خالق سے تعلق ہے، فادر!
جو اپڑا اینگلا اور سشمن ناڑیوں کی مدد سے نیچے بدن میں آتا ہے تو بچے پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے
پیچھے تیسری آنکھ کے قریب آتا ہے تو افسانے۔ میں نے بھی 'کنواری' کی قبیل ایک کہانی "لمبی لڑکی"
کے نام سے لکھی ہے، جس میں لڑکی اس قدر لمبی ہے کہ اسے اپنے قد کا لڑکا نہیں ملتا۔ اسی کڑھن میں اسکی
دادی مر بھی نہیں پاتی حالانکہ سامنے اس کا اپنا لڑکا، لمبی لڑکی کا باپ دم توڑ دیتا ہے۔ آخر ناٹے قد
کا ایک لڑکا اس لڑکی کو دیکھنے آتا ہے جسے اٹھنے، چلنے پھرنے کی ممانعت ہے کیونکہ ایسے میں اسے
اپنی لمبان کے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر شادی ہو جاتی ہے اور پھیروں میں لڑکی کو دہری،
تہری ہو کر چلنے کی ہدایت ہے۔ کیسی بے بسی ہے جس میں وہ لڑکی اس ہدایت پر عمل کرتی ہے مگر نہیں
جانتی؟ شادی کے بعد دلہا دلہن دونوں دور [illegible]م چلے جاتے ہیں اور جب مہینوں کوئی خط نہیں
آتا تو بڑھیا کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے میاں نے اسے نکال دیا ہوگا۔ سال کے بعد ایکا ایکی وہ
وارد ہو جاتے ہیں مگر اس وقت بھی بڑھیا دھپ سے ہاتھ لڑکی کے سر پہ مارتی ہے اور اسے نیچی
ہو کر چلنے کے لئے کہتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات ہی نہیں بیٹھتی کہ اب تک لڑکے اور لڑکی نے
ایک دوسرے کو دیکھ پرکھ لیا ہوگا۔ یہ کیسا ڈر تھا جس کا شروع اور آخر تو تھا لیکن بیچ کی منزلیں
غائب تھیں، جب بڑھیا کو پتہ چلتا ہے کہ لڑکی پیٹ سے ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی

بونی بس گئی ہے۔ اب وہ تسلی سے مر سکتی ہے۔ لیکن مرنے سے چند ہی لمحے پہلے اس کے بوڑھے جھرّیوں سے پٹے چہرے پر مسکراہٹ چلی آتی ہے اور وہ لڑکی سے پوچھتی ہے۔" ہائے ری منی! تیرا وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہوگا؟ ..... پھر ... پھر واتاورن میں درایت تو پربل ہو اٹھتا ہے اور بڑھیا کے سرہانے رکھی ہوئی گیتا کے پنّے ہوا میں اڑنے لگتے ہیں اور اس جگہ پہ آ کر رک جاتے ہیں جہاں شبد سماپت، لکھا ہوتا ہے......

.... میں اس کہانی میں آپٹیکل اِلُوژن کی بات نہیں کرتا جس میں لمبی سی لمبی لڑکی لیٹنے میں چھوٹی ہو جاتی ہے بلکہ اس ترتیب اور ہم آہنگی کا قصیدہ کہتا ہوں جو انسانی دماغ ہر بےہنگم چیز میں پیدا کر لیتا ہے۔ اس پر بھی کرشن چند کی کہانی میری کہانی سے بہتر ہے۔ ہاں فادر! میں اپنے اس ہمعصر کی تعریف محض رقابت کے جذبے سے کر رہا ہوں۔ لیکن اسے رقابتِ رفاقت کہتا ہوں۔ وہ بھی ایسے ہی میرے ساتھ رفاقتِ رقابت کرنے آئے ہیں۔

جیف کہ آپ نے کرشن چندر کی کوئی کہانی پڑھی ہے، نہ عصمت کی اور نہ منٹو کی۔ آپ تو ناچ رنگ، سینما تماشے، ننھے کہانیوں کو ایسی باتیں سمجھتے ہیں جو آپ کو ازلی حقیقت سے پرے لے جاتی ہیں۔ آپ کی نظروں میں وہ سب پاپ ہے جو ہندو فلسفیوں کے نزدیک "پرے اور آپ" کا مرکب ہے۔ یعنی کہ وہ چیز جو آپ کو اپنے "آپ" سے پرے لے جائے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں، فادر! کہ میں نے ہمیشہ اس آپ سے پرے ہٹنا چاہا، کیوں کہ میرے نزدیک یہی انسانی حصول کی معراج ہے۔ کیا آپ نے مصری رقاصہ حلیمہ کے لچکیلے بدن کو رقص کے عالمگیر اشارات میں ہاں ہاں کرتے دیکھا ہے؟ کم از کم روسی بیلے میں مارگٹ فونٹین اور نیورئیف ہی کو دیکھ لیتے تو پتہ چل جاتا کہ خالق کا اپنی تخلیق سے کیا رشتہ ہے؟ روسی بیلے ڈانسر تو کثرتِ تعلیم کی وجہ سے اس بات کو نہیں جانتے لیکن آپ تو جانتے ہیں؟ سونجا ہینی کو تو برف پہ اسکیٹ کرتے دیکھنے میں تو کوئی گناہ نہیں؟ کیسے وہ برف پہ خط اور دائرے بناتی، زندگی اور ماورا کے چکّر سمجھاتی ہے؟ کچھ نہیں اس برف ہی کو چوم لیتے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور جو آپ کے جسم و ذہن کا حصّہ ہو چکی ہے۔ آپ نے یہودی مینوہین کی وائلن نہیں سنی تو کیا روی شنکر اور ولایت حسین کی ستار سنی ہے؟ وہ بھی تو روح ہی کی آوازیں

ہیں۔ سبو لکشمی "میرا" کے بھجن بھی تو گاتی ہے جس سے آپ اپنے مطلب کی بات سمجھ سکتے ہیں اور میں اپنے مطلب کی۔ بالا سرسوتی بوڑھی ہو گئی ہے، فادر، یا گورو کرپ جوان ہو گیا ہے؟ حسین، آرا، پدمنی اور گائی تو نڈے محل نہیں بنا سکتے حالانکہ ہمارے مندر، مسجد، گرجے اور ملوں کی چمنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ باپ روزاریو! آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارے دیس کی ستی ساوتری بھی وہی بات کہتی ہے جو امریکہ کی ریٹا ہیورتھ۔ جب وہ اپنے میاں آرسن ویلز سے طلاق لیتی ہے۔ فرانسیسی ایکٹرس یاں مورو کی اداکاری دیکھی ہے اور اس کے بعد اس کا بیان پڑھا ہے جس میں وہ کہتی ہے کہ فن کے اوج کو چھو لینے کے لئے میرے نزدیک اس ڈائرکٹر کے پاس سونا ضروری ہے، جس کے ساتھ میں کام کر رہی ہوں! شیک ناچ والے بھی آپ ہی کی طرح سے اس بدن کو جھٹک دینا چاہتے ہیں جو روح کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ جرمنی کی نئی بیماری جو سینے دو LET KISS کی راہ بھی روح کے مرکز کو جاتی ہے لیکن بدن سے ہو کر۔ آپ اگر مانتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں تو پھر عیسائی کون ہے، مسلمان کون اور ہندو کون؟ پھر میری کہانیوں سے استغنا کیسی؟ تنہا آپ ہی نہیں، باپ روزاریو! جو کہانی کو مہمل بات سمجھتے ہیں۔ اور بھی بہت سے باپ ہیں۔ جب میں نے اپنی پہلی کہانی لکھی تھی تو میں اتنا ہی خوش تھا جتنا کہ اس دنیا کی تخلیق کے بعد خدا خوش ہوا ہوگا۔ کیا دنیا لے ممکنات تھی جو میرے دماغ کے الٰہ دینی چراغ نے میرے سامنے کھول دی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ گھر میں غریبی کا دور دورہ تھا۔ بڑوں میں سے فقط میرے بڑے تاؤ جی رہ گئے تھے جو کسی طرح سے ہمارے نان نفقے کے کفیل نہ ہو سکتے تھے کیونکہ ان سے اپنی چھوٹی سی زمینداری بھی نہ چلتی تھی۔ ایک دن میں نے ان سے کہا — آپ سب بھول جائیے تاؤ جی! مجھے کہانیاں لکھنی آگئی ہیں اور میں ان سے بہت پیسے کماؤں گا۔ میرے تاؤ آپ سے بھی زیادہ بھولے تھے، فادر روزاریو! وہ "جپ تپ، نیم سیج سنجم" کے بہت قائل تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا — "کیا تم زندگی بھر جھوٹ ہی کی کمائی کھاؤ گے، جاہن؟"

جب سے میں برابر جھوٹ بول رہا ہوں، فادر، لیکن اسے جھوٹ سچ کہتا ہوں۔ یہ ترکیب

میں نے اپنی آسائش اور سہولت کے لیے نہیں بنائی بلکہ میں اس کا قائل ہوں۔ آپ کے خدا کی زبان کبھی خالص سچ نہیں ہے وہ کبھی کنائے میں بات کرتا ہے۔ اس نے کبھی سامنے آکر سچ کے طریقے سے نہیں کہا ــ میں ہوں ــــ اس نے کسی قتل کے مقدمے میں گواہی نہیں دی۔ حالانکہ بعض حالات میں قتل صرف اسی نے دیکھا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے ــــــ تم ہو اس لئے میں ہوں۔ گواہ ڈھونڈنے کے لئے دوڑو، بھاگو اور اگر کوئی نہ ملے تو پیدا کرلو۔ آدمی سخت پریشان ہوتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ آج گواہ کو پیدا کرنا شروع کیا تو کتنی دیر میں وہ پلے گا اور پل کر جوان ہوگا؟ وہ کہتا ہے، میری مملکت میں انگلیوں کی لکیریں مسکت گواہی دیتی ہیں، اینٹ پتھر بھی بولتے ہیں۔ ان کا بیان نہ لے سکو تو ایسے ہی کان کھول کر پھرو۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں قاتل کی آستین کا لہو پکار رہا ہوگا۔ اگر وکیلوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قاتل بری ہو جائے تو وہ بھی کچھ نہیں کہتا۔ ضرور پچھلی زندگی میں مقتول نے قاتل کو قتل کیا ہوگا۔ اس لئے اس کی زندگی میں حساب بے باق ہو گیا۔ وہ ہمیں کبھی ایک خوبصورت ساخر گوش ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور کبھی بدصورت سا خارِ پشت۔ یہ اس کی کہانیاں اور پہیلیاں ہیں جو ہماری سمجھ کو آزماتی اور صیقل کرتی ہیں۔ پنجابی شاعر گلیریا کے مطابق اس نے گلاب کو بیسیوں زبانیں دی ہیں لیکن وہ چپ ہے۔ اگر بات کرنا ہے تو اشارے کی زبان میں۔ خدا کی اپنی زبان بھی تلمیح (ALLUSION) کی ہے۔ اور وجود التباس (ILLUSION) کا وہ خود مایا کی معرفت باتیں کرتا ہے اور کبھی ٹھیٹ سچ نہیں بولتا۔ گلیلیو، منصور، سقراط، عیسیٰ اور گاندھی اسی لئے مارے گئے کہ انہوں نے خالص سچ بولا اور جھوٹ سچ کی عظمت کو نظر انداز کر گئے۔ انہوں نے اپنے سامنے لوگوں کو اس سلسلے میں شہادت پاتے ہوئے دیکھا مگر یہ بھول گئے کہ انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن سامنے کا سچ نہیں۔

آپ کھرے کھرے سچ میں یقین رکھتے ہیں، باپ رو زار یو! تو لیجئے میں آپ کو کچھ سچی باتیں اپنی کہانیوں کے سلسلے میں بتاتا ہوں۔ وہ بالکل سچی ہیں۔ دیسی گھی کی طرح خالص اور گارنٹی گا اسی۔ میں نے اپنی کہانی "ببل" میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ مرد اور عورت کے بیچ خوش وقتی

برحق ہے، لیکن انسانی معاشرے کا کوئی ہین نقشہ سوائے اس بات کے نہیں بنتا کہ مرد اور عورت شادی کریں اور اس کے بعد بچوں کی ذمہ داری قبول کرلیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جنسی فعل میں تقدیس پیدا ہو سکتی ہے۔ جسے دنیا کے ننانوے فیصدی لوگ گندہ اور نجس سمجھتے ہیں اور اسے دردناک بلکہ شرمناک مجبوری گردانتے ہیں ..... دربار ی لال ایک بچے ببّل کو اس کی بھکارن ماں مصری سے کرائے پہ لے کر سیتا کو ہوٹل میں لے جاتا ہے تو سب اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ حالانکہ اس سے ایک ہی روز پہلے کسی دوسرے ہوٹل والے نے لچا لفنگا کہہ کر بھگا دیا تھا۔ وہاں جب وہ سیتا کے ساتھ ہمبستری کرنے لگتا ہے تو ببّل رونے لگتا ہے۔ درباری اسے مارنے کے لئے دوڑتا ہے لیکن نیم عریاں سیتا دوڑ کر بچے کو پکڑ لیتی ہے اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ وہ درباری کو دنیا کا اسفل ترین آدمی سمجھتی ہیں۔ جس نے اس کام کے لئے ایک معصوم بچے کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہے، بچے کے ساتھ، جو عورت —— ماں کا غیر منفک حصّہ ہے اور ایسی نظروں سے درباری کی طرف دیکھتی ہے کہ اس پہ گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔ وہ اسی منفعل حالت میں سیتا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پہلے شادی کرے گا..... جس سچ سے میں نے کہانی کا پلاٹ لیا ہے، بابِ روز ار ہوا اس میں میرے ہیرو نے وہسکی پی کر اور پانچ روپے والا پان کھا کر، سیتا کی اس حد تک آبرو ریزی کی تھی کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہسپتال لے جائی گئی اور جلّاب سے بچے کے پیٹ میں سے افیون اور اسکا اثر دور کیا گیا۔

اور سچ کہوں ؟ "ٹرمینس سے پرے"۔ میں موہن جام وکٹوریہ ٹرمینس کے اسٹیشن پہ اپنی بیوی کو پہاڑ پہ جانے کے لئے رخصت کرتا ہے۔ گاڑی چلتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی واقف کار اچلا نے اسی گاڑی میں اپنے شوہر کو دلی کے لئے رخصت کیا ہے۔ موہن جام اچلا کو اپنی کار میں لفٹ دیتا ہے اور اس طریقے سے آگ اور تیل کا گھٹیا سا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے تضادات ایک طرف گناہ کے محرک ہوتے ہیں تو دوسری طرف سدّ باب بھی۔ اچلا موہن جام کو زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے اور کہتی ہے —— کیا مرد اور عورت کے درمیان اور کوئی رشتہ نہیں بنتا ؟ کیا وہ بہن بھائی

نہیں ہو سکتے ؟.... موہن جام برافروختہ ہو کر اسے بہن کہہ دیتا ہے، لیکن —
ادھر موہن جام کی بیوی سومترا لوٹ آتی ہے اور ادھر اچلا کا شوہر رام گدگری —
رکھشا بندھن کے دن موہن جام تین ساڑھے تین سو کی ساڑی اور سو روپیہ نقد اچلا کی نذر کرتا ہے۔ حالانکہ اس شہر میں اپنی سگی بہن کو اس نے صرف دس روپے دیئے تھے۔ اچلا اس دن صبح ہی سے سجتی بنتی رہی تھی اور اس نے جو رکھشا موہن جام کے لئے بنائی تھی، اس میں کلابتوں کے علاوہ سچے موتی ٹانکے تھے۔ موہن جام رکھشا بندھوا کر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ جبھی اچلا کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور وہ اپنے میاں رام گدگری سے لپٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے۔ "مجھ سے پیار کرو، اور، اور....!" اب حقیقت یہ ہے کہ موہن جام اور اچلا نے باہمی سازش سے علی الترتیب اپنی بیوی اور اپنے میاں کو بھجوا دیا تھا۔ اب اچلا کے ہاں ایک بچہ ہے جسے اچلا کا شوہر رام گدگری اپنا سمجھتا ہے اور روز اس سے کھیلتے ہوئے کہتا ہے "میرا چنو، میرا منو...
یہ نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت اور بدکاری ہی بدکاری ہے۔ نیکی کا سچ یہ ہے کہ میرے افسانے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی آندو اپنی حقیقی زندگی میں اتنی "بلند کردار" بن چکی ہے کہ اسے اپنے سوا کوئی آدمی اچھا ہی نظر نہیں آتا۔ سب گندے اور غلاظت سے پٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لڑکے، اس کی لڑکیاں حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے سب اپنی پہلی فرصت میں اس سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اکیلی بیٹھی پوجا پاٹھ کیا کرتی ہے اور کبھی کبھی آنے جانے والوں کو اس کی وحشتناک ہنسی سنائی دیتی ہے۔
سچ سننے کی تاب کس میں ہے، باپ روزار یہ؟ نہیں میں سچ نہ بولوں گا جو آپ کے سچ سے ارفع ہو، یعنی اس میں جھوٹ کی حسین سی آمیزش ہو۔ ایسا نہ کروں گا تو معاشرے میں طوائف الملو کی پھیل جائے گی۔ لوگ مجھے مار دیں گے اور میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی سے بڑی کمینہ سی محبت ہے۔ میں شہادت کو پسند کرتا ہوں۔ بشرطیکہ کسی دوسرے کی ہو۔ میں اپنی بیٹھ پر صلیب اٹھاتا ہوں۔ لیکن اس امید میں کہ ایک دن اسے جھٹک دوں گا۔ پہلے میں بہت بے ضرر قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا، فادر جن کا تعلق سطح محض سطح سے تھا۔ اب جب کہ میں نے انسان کے تحت الشعور میں

جانے کی کوشش کی ہے تو پہلے ہی نقادوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم جنس لکھنے لگے ہو۔ میں جنس پہ لکھتا بھی ہوں، باپ روزاریو! تو ایک ذمے داری کے احساس کے ساتھ۔ ایسے ہی ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لئے نہیں۔ یوں مجھے اپنے گناہ جو پوری طرح سے گناہ نہیں بن پاتے، بیحد عزیز ہیں۔ دراصل میں آپ کے پاس اتنا اعترافِ گناہ کے لئے نہیں آیا جتنا یہ بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ میں اور گناہ کروں گا تاکہ آپ کی نوکری بنی رہے۔ میں مجبور ہوں، باپ روزاریو!
جب گناہ کی گھڑی آتی ہے تو میرے جسم و ذہن بلکہ کام و دہن اسی طرح سے کانپنے لگتے ہیں جیسے آپ حسنِ ازل سے دوچار ہو کر۔ میں بھی اپنے میدانِ عمل میں ایک طرح کا پادری ہو گیا ہوں فائل خود مقدمے کی سماعت کے لئے میرے پاس آتے ہیں۔ میرے لکھنے کے کمرے میں جو ویڈ پلانٹ ہے اس نے روٹھ کر مجھ سے کہا ——— دو دن ہو گئے، تم نے مجھے پانی ہی نہیں ڈالا۔
میں کیا جواب دیتا۔ میں نے شرارت سے کہا۔ کئی روز ہو گئے، تم نے مجھے گھاس ہی نہیں ڈالی۔
وہ ہنس پڑا اور میں رو دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے پتوں کو چوما۔ ہاتھ سے اپنے بدن کی حرارت دی جو کثرتِ گناہ سے ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے اپنے بدن کی ہری ٹھنڈک دی۔ میرے گھر کے سامنے ایک ڈسٹ بن ہے جہاں محلّے کے لوگ کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اس میں ڈبل روٹی کا ایک سلائس پڑا تھا۔ میں کہیں ادھر سے گزر رہا تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں سے سر اٹھا کر اس نے مجھ سے کہا۔ دیکھو، دیکھو جاہن، مجھے کہاں پھینک گئے ہیں؟ یہ میری جگہ نہیں ہے۔
جب کہ اسی سڑک کے موڑ پر، پان والے کی دکان کے پاس کئی بھوکے گھوم رہے ہیں۔ ابھی ابھی میرے پروڈیوسر نے کہا ہے کہ پکچر آگے نہیں چلے گی کیونکہ ہماری ہیروئن حاملہ ہو گئی ہے۔ اب ہم اور ہمارا پورا یونٹ اگلے چھ آٹھ مہینے تک بیکار رہیں گے اور ہیروئن کی صحت کے لئے دعائیں کرنے پہ مجبور یا ایک دوسرے کے ساتھ سرپھٹول کریں گے۔ جو کہ ہر آدمی بیکاری میں کرتا ہے!
سامنے ڈان باسکو اسکول کا گرجا دیکھ رہے ہیں نا؟ اس میں بجنے والے گھنٹے کی آواز بیحد خوبصورت ہے۔ میں مندر اور مسجد وغیرہ میں تو نہیں جاتا، لیکن گھنٹوں کی آواز اور اذان مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔ میں ان کی بازگشت کا پیچھا کرتا ہوا اتنی دور نکل جاتا ہوں کہ آپ اس کا

اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں انہی کی طرح لطیف سے لطیف تر ہوتا جا رہا ہوں۔ روح کا تو وزن نہیں ہوتا، میرا بدن بھی بے وزن ہو جاتا ہے اور میں پوری کائنات پر پھیل جاتا ہوں۔ جب میری شکل جا ہن کی نہیں رہتی۔ میں وہ پرماتما بن جاتا ہوں جو "اروپ" اور "نراکار" ہے۔ مجھے خدا کی اس بے صفتی سے بیحد محبت ہے کیونکہ اس کی اسی صفت سے ہم جو کہانیاں لکھتے اور تصویریں بناتے ہیں، اپنے لیے گنجائش پاتے ہیں۔ جیسے ہم بھی اپنے طریقے سے چھوٹے چھوٹے خدا ہیں۔ جب میں اپنے دل کی خوبصورت گھلاوٹ میں گلیریا کی نظم پڑھتا ہوں۔

اے روپ! میں کبھی تو روپ ہین ہوں۔

تیرے روپ کی جوتی، میرے آکار کی سیاہی کو روپ مان اور راجا گر کر دیتی ہے۔

تیرے روپ کی جوتی — میرا جیون آدھار ہے۔

اس کے بنا میرے وجود کا رنگ اور میرے آکار کے چتر مجھ ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔۔۔

فادر روزاریو! میں اپنی اس آگہی سے کبھی خود ہی متوحش ہو اٹھتا ہوں۔ آپ اندازہ کیجئے وہ آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے جسے اپنی روح کے اندھیرے میں ایک ساتھ لاکھوں کروڑوں آوازیں سنائی دیں؟ جو اس قدر لطیف ہو جائے کہ خود کو بھی ڈھونڈنے پر نہ پا سکے۔ جب آگہی آتی ہے تو آپ اپنی ذات میں ہزاروں معجزے ہوتے دیکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر کثیف و لطیف چیز کا رشتہ سمجھ لیتے ہیں اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ایک بے بضاعت سی چیونٹی بھی استعارہ بدوش آپ کے سامنے چلی آتی ہے۔

کیا کہا، باپ روزاریو، آپ کلیسا چھوڑ رہے ہیں؟ نہیں فادر، خدا کے لئے ایسا مت کیجئے۔ میری طرح اکیلے جینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ آپ اور آپ کی قبیل کے اور لوگ جی ہی نہیں سکتے، جب تک وہ کسی مذہب، فرقے یا گروہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے جو کبھی جھوٹ سچ بولا ہے، وہ ہر کسی کے کام کا نہیں۔ آپ نے کلیسا چھوڑ دیا تو آپ مر جائیں گے اور وہ بھی پاگل ہو کر۔۔۔۔

مجھے اجازت دیجئے فادر! وہ آدمی جو ایک مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا تھا اور عورت کو الگ لے جانے کے بعد آج تک لوٹا ہی نہ تھا، ایکا ایکی کہیں سے چلا آیا۔ میں جا کر ذرا اس سے پوچھوں تو کہ آخر بات کیا ہوئی؟ ——— ●●●

مہندر ناتھ

۵ ۵ ۵

کھڑکی میں بیٹھے ہوئے نرملا نے گزرے ہوئے برسوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ پندرہ سال پہلے اس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور وہ لاہوری دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا باپ بچپن میں مر چکا تھا۔ صرف ماں زندہ تھی۔ ماں نے اسے کیسے پالا پوسا تھا؟ اس کے متعلق اسے کوئی خاص علم نہ تھا اور نرملا نے یہ جاننے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔ پانچویں جماعت تک ماں نے نرملا کو پڑھایا تھا۔ اس کے بعد وہ ناچ سیکھنے لگی تھی۔ چند برسوں میں وہ نرت سے اچھی خاصی واقف ہو گئی۔ جب کبھی وہ کوئی فلمی گانا سن لیتی تو خود بخود اس کے پاؤں گانے کی دھن پہ تھرکنے لگتے۔ نہ جانے اسے ناچ سے اتنا عشق کیوں ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہ ناچتا تھا۔ نہ باپ کو اس قسم کے آرٹ سے شغف تھا اور نہ ہی ماں کو۔ اور دور دراز سے جو رشتے دار ملنے آتے انہیں تو اس پیشے یا آرٹ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اس کی ماں ہی تھی جس نے اسے ناچنے کے فن میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ یوں نرملا کا قد خاصہ لمبا تھا۔ سرو قد کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔

لمبی لمبی مخروطی انگلیاں، مضبوط اور توانا باہیں۔ چہرے کا رنگ گندمی نہ تھا بلکہ گندمی رنگ سے زیادہ صاف اور شفاف تھا۔ ماتھا چھوٹا، بال گہرے سیاہ، آنکھیں موٹی موٹی، چہرہ لمبوترا اور پاؤں بے حد حسین تھے۔ اگر کوئی آدمی پہلے نرملا کے پاؤں دیکھ لیتا تو شاید اس کے چہرے کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ یوں تو اچھی خاصی ڈیل ڈول کی تھی، جسم کی ہڈیاں دہری تھیں۔ وہ نازک اندام سی لڑکی نہ تھی کہ چھوئی موئی کی طرح بل کھا کر سمٹ ہی جاتی۔ جب سامنے کھڑی ہو جاتی تو ایک باوقار سی لڑکی لگتی۔ کبھی کبھار تو یوں احساس ہوتا کہ کسی جاٹ کی لڑکی ہے، جس کے باپ نے کھیتوں میں ہل چلایا ہو گا۔ کبھی تو جسم سے ایک توانائی

اور مضبوطی کا احساس ہوتا تھا جو بہت کم لڑکیوں کے جسموں سے جھلکتا ہے۔

نرملا کا مستقبل اتنا روشن نہ تھا۔ ماں کی عمر اس وقت سینتالیس برس سے اوپر ہی تھی اور اس کا سرمایۂ حیات صرف نرملا تھی۔ اگر نرملا کی پرورش متوسط طبقے میں نہ ہوتی تو نرملا کب کی بازارِ حسن کی نذر ہو جاتی۔ نرملا کی ماں نے اچھے دن دیکھے تھے۔ اصلی دودھ اور گھی کھایا تھا اور پنجاب کے کھیتوں کا گیہوں اس کی رگوں میں جوش مارتا تھا اور اس نے اپنی جوانی میں نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگائی تھی اور آم کے درختوں کے تلے بیٹھ کر شیریں آم چوسے تھے۔ نرملا کی ماں آسانی سے اس راہ کی طرف راغب نہ ہو سکی اور نہ ہی نرملا کو اس راہ پر چلا سکی۔

جب لڑکی حسین ہو، جوان ہو، ماں بوڑھی ہو اور گھر کے اندر گھنگرو کھنکتے ہوں تو خود بخود راہگیر دل اور منچلے نوجوانوں کی نگاہیں اس گھر کی طرف اٹھیں گی۔ نوجوان آوازے کس کے گزر جاتے۔ چند نرملا کو تاکتے رہتے اور جب کبھی اس کے قدوقامت کو دیکھتے تو کہتے ـــــ "یار اگر اس نے ایک چانٹا مار دیا تو میرے عشق کا بھوت نکل جائے گا۔ اس لئے اس گھر میں قدم رکھنے کے لئے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بے حد چالاک اور سمجھدار ہو۔ جو بات یوں کرے کہ معلوم ہو کہ محض دوستی اور ہمدردی کا غلاف اوڑھ کر اس نے ادھر کا رخ کیا۔ اس کے ذہن پر ریشمی زلفوں کا کوئی سایہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا فرادا حسینہ کے پائل کی جھنکار اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ وہ ہوش و حواس کھو کر اس میخانے کا رخ نہ کرے تو بات بن سکتی ہے۔"

سیٹھ جواد علی اسی محلّے میں رہتا تھا جس نے اینٹوں کے بزنس میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ ابھی تیس پینتیس برس کی عمر تھی۔ صرف ایک شادی کی تھی۔ تین اور شادیاں کرنے کا ارادہ تھا۔ بے حد بانونی، رنگت کالی، مگر دل کا بڑا ٹیکنی کلر تھا۔ خوبصورت لڑکی دیکھتا تو آن واحد میں فریفتہ ہو جاتا۔ سمنٹ اور چونے کے بیوپار میں کس کو فائدہ نہیں ہوتا۔ مکانوں میں چونا لگانے کے علاوہ جس کا مکان تیار کرتا اسے بھی چونا لگا دیتا۔ گو تھا ان پڑھ مگر سوجھ بوجھ پڑھے لکھوں سے زیادہ تھی۔ کمبخت اگر ذرا بھی خوش شکل ہوتا تو ڈاکٹر دارڈ کی طرح ایک حرم آباد کر لیتا۔

اس لئے جب کبھی نرملا اس کے قریب سے گزرتی تو اس کا دل ہچکیاں لینے لگتا۔ سارے جسم میں ایک

جھرجھری سی آجاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ شے اس کے لئے ممنوع تھی اور اس کے پہنچ سے باہر تھی۔ مگر انسان اس نامراد دل سے کیا کہے۔ نرملا کو دیکھ کر اس کی رگوں میں خون کیوں جوش مارنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی سے کیا کہے، کس سے کہے؟ ماں سے یا بیٹی سے؟ اپنے بدصورت چہرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اور نرملا کی خوبصورتی کا اندازہ کرتے ہوئے یہی مناسب تھا کہ پہلے ماں سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔ عید کے دن وہ مٹھائی کا ایک خوبصورت ڈبہ لے کر نرملا کے گھر وارد ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے اپنا تعارف کرایا اور کہا ــــ "ماں جی! میں آپ کے محلے میں رہتا ہوں۔ آج عید ہے۔ اس لئے سوچا اسی بہانے مل لوں۔" نرملا کی ماں نے جواد علی کو دیکھا۔ بڑا ہی بدصورت آدمی تھا۔ لیکن ڈبہ خوبصورت لایا تھا۔ اس کی باتوں میں چاشنی اور لطافت تھی۔ بات بات میں ماں جی، ماں جی کہتا رہتا۔ جیسے نرملا سے اسے دلچسپی نہیں۔ طرز تکلم میں خوشامدانہ پہلو زیادہ نمایاں تھا اور خوشامد سے تو خدا بھی راضی ہو جاتا ہے۔ نرملا کی ماں تو محض ایک عورت تھی جو جواد علی کا نام سن چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جواد علی ایک امیر آدمی ہے۔ اس لئے نرملا کی ماں نے خاموشی سے مٹھائی کا ڈبہ لے لیا۔ جواد علی نے ادھر ادھر دیکھا ضرور۔ مگر اسے نرملا نظر نہ آئی۔ بس دل ہی دل میں اس کافر ادا حسینہ کے حسن کی داد دے کر اور ماں جی کو آداب کہہ کر باہر نکل آیا۔

نرملا گھر پہنچی تو ماں نے جواد علی کا ذکر کیا اور ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ دکھایا۔

نرملا نے جواد علی کا نام سن رکھا تھا مگر اس کی شکل و صورت نہ دیکھی تھی۔

"ماں کیسی صورت ہے اس کی؟"

"بس بیٹی، نہ پوچھو بیٹی۔ دیکھ کے بس قے آوے۔ کالا کلوٹا۔ مگر باتیں شہد کی طرح میٹھی اور رسیلی کرتا ہے۔"

"ماں ایسے انسانوں کے پاس لکشمی کیسے آتی ہے؟"

"شاید لکشمی بھی رنگ روپ نہیں دیکھتی۔ انہی کے پاس زیادہ آتی ہے جن کے پاس پہلے ہی لکشمی ہوتی ہے۔"

"کیا کہنے آیا تھا؟"

"بس یہ ڈبہ دیا اور چلتا بنا ــــ" ماں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

ادھر جواد علی نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ چکّر چلایا جا سکتا ہے۔ ماں اتنی تنگ نظر نہ تھی کہ وہ اس محدود سے دائرے میں سما نہ سکتا۔ نرملا کی ماں کو اس کا آنا بُرا لگتا تو وہ مٹھائی کا ڈبہ واپس کرتی۔ اگر ماں نے اس کے آنے جانے پر کوئی روک تھام نہ لگائی تو بیٹی کو رام کرنا مشکل نہیں۔ جواد علی نے نرملا کے گھر آنا جانا شروع کیا۔ اکثر ماں سے ملاقات ہوتی۔ جب کبھی جواد علی آتا کوئی نہ کوئی چیز ساتھ لاتا۔

بڑے ادب اور سلیقے سے بیٹھتا۔ باتیں ماں سے کرتا اور نگاہیں نرملا کو ڈھونڈتیں۔

"بس ماں جی۔ تازہ خربوزوں کا ٹوکرا کیا آیا کہ میں نے سوچا کہ پہلے ماں جی کے پاس چلوں امید ہے کہ اس غریب کا تحفہ قبول کریں گی۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بیٹا۔ ارے تم اس علاقے کی ناک ہو۔"

"نہیں ماں جی۔ میں آپ کی جوتیوں کی خاک ہوں۔ بس آپ سے ملنے چلا آتا ہوں۔ آپ کی نظرِ عنایت چاہئے ماں جی۔ دولت نے کس کا ساتھ دیا جو میرا ساتھ دے گی۔ بس مجھے تو صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔ خدا عزت سے رزق دیتا رہے یہی میری دلی تمنا ہے۔ اچھا ماں جی۔ مجھے اجازت دیجئے گا۔"

"بیٹا کچھ چائے پانی۔"

"پھر کسی دن ماں جی۔"

یہ کہہ کر جواد علی چلا جاتا۔ یہ عجیب و غریب سی بات تھی کہ جب کبھی جواد علی آتا تو نرملا گھر میں نہ ہوتی اور ماں بھی نرملا سے جواد علی کے خلوص، ایثار، انسانی دوستی اور بھائی چارے کا ذکر کرتی۔

"بڑا خوش خلق اور ملنسار آدمی ہے نرملا۔"

"کم بخت کی صورت بڑی بدصورت ہے ماں۔"

"سیرت کا جواب نہیں۔"

"سیرت کس نے دیکھی ماں۔ ظاہری خول سے کیا پتہ چلتا ہے ماں کہ انسان کے اندر کیا ہے؟"

"اندر کی بات تو پرماتما ہی جانے بیٹی۔"

جواد علی نے ماں کو تحفے دے کر اس پر جادو سا کر دیا۔ سنجیدہ انداز میں باتیں کر کے اپنی شرافت کا سکّہ جما لیا۔ جواد علی اب موقعے کی تاک میں تھا کہ وہ نرملا سے بات چیت کا سلسلہ شروع

کرے اور دیکھے کہ اس پری جمال لڑکی نے اس کی شخصیت سے کیا اثر لیا۔ آتے جاتے جواد علی نے یہ محسوس تو کر لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ کبھی کبھار جواد علی جب ماں سے باتیں کرنے لگتا تو وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی جاتی اور جب تک وہ باتیں کرتا رہتا وہ کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ جواد علی نے اس نفرت کو محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر کھل کر بات کی تو منہ کی کھانی پڑے گی۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی کیسے ممکن تھی۔ وہ مسلمان تھا اور نرملا ہندو۔ وہ بدصورت تھا اور نرملا خوبصورت۔ وہ نرملا سے عمر میں کہیں بڑا تھا۔

بس ایک بات میں وہ نرملا سے بہتر تھا کہ وہ امیر تھا۔ ماں اور بیٹی کی بڑی مشکل سے گزر ہوتی تھی اور جواد علی کو اس بات کا احساس تھا۔ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کھوٹے کو کھرا بنا سکتا ہے اور سچے کو جھوٹا۔ ان سکوں کے آگے بڑے بڑوں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہ تو محض دو عورتیں تھیں، اکیلی، بے سہارا، بے بس۔

پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیئے۔ محض روپوں کی نمائش کر کے انسان نہیں خریدے جاتے۔ کچھ سلیقہ، کچھ طور طریقہ، وقت اور حالات کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہیئے۔ پہلے نرملا کی ماں سے بات چیت کی جائے۔ بڑھیا کے دل میں ڈوب کر اس انمول موتی کو سیپ سے باہر نکالا جائے۔ بس اسی امید پر جواد علی غوطہ زن ہوا اور جب غوطہ لگا کر ابھرا تو ہاتھ میں نہ سیپ تھا نہ موتی۔ ایک فقیر کی طرح دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ماں نے صاف کہہ دیا۔" میں آپ کو اتنی گندی ذہنیت کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ سوچ سمجھ کر تو بات کرتے۔ ہم ٹھہرے ہندو، آپ مسلمان۔ پھر آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ عمر میں نرملا سے بڑے ہیں آپ۔ کسی طرح بھی یہ بات بنتی نظر نہیں آتی۔ دوبارہ ایسی بات منہ سے نہ نکالیے نہیں تو میں بہت بری طرح پیش آؤنگی۔"

جواد علی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ جواب سن کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ دل کی بستی پر کسی نے شب خون مارا تھا اور سارا مال و متاع لے کر چلا گیا۔ جواد علی کا شمار بے وقوف عاشقوں میں نہ ہوتا تھا کہ گریبان چاک کر کے کسی ویرانے کی طرف رخ کرتے ——— وہ تو بیسویں صدی کا عاشق تھا۔ سیمنٹ اور چونے کا بیوپاری جس نے گھروں کو تعمیر کرنا سیکھا تھا اجاڑنا نہیں۔ ناکامی کے بعد اپنے آپ کو ختم کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ یوں وہ ایک بات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ نرملا کی تصویر ان کے

دل و دماغ پر ایسی ابھری کہ جواد علی نے اسے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر یہ تصویر ایسی ابھری تھی کہ پرانے نقوش مٹتے گئے اور ایک البیلی، مستانی شوخ رنگ کی تصویر قطب مینار کی طرح سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ نرملا اور اس کی ماں نے لاہور چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا۔ بمبئی تو روشنیوں کا شہر تھا۔ چاندی کے سکوں سے جگمگاتا ہوا شہر جہاں حسین لڑکیوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جہاں روپیوں کی کمی نہیں اور حسن کے پجاریوں کی بھرمار ہے۔ بس لڑکی حسین، خوبصورت اور پرکشش ہونی چاہیے۔ یوں صرف لڑکی ہی ہو تب بھی چلے گی اور شہر میں کما کھائے گی۔ بھوکی نہیں مرے گی ——— اور اگر ذرا گورے رنگ کی ہو، جسم گولائیوں محرابوں سے مرصع ہو، آواز میں کھنک اور جادو ہو اور زلف ماتھے پر پریشان ہو، چال البیلی اور مستانی ہو، آنکھیں نیلی نیلی۔ کسی گہری جھیل کے پانیوں کی طرح اور جب سیاہ زلفیں فضا میں لہرائیں تو آسمان پر کالی گھٹا چھا جائے تو سمجھو الہ دین کا چراغ آپ کے پاس ہے اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا الگ بات ہے۔

نرملا نے اس شہر میں وارد ہوتے ہی طوفان مچا دیا۔ فلمی جوہریوں نے اس موتی کو پرکھ کر ناچنے والی کا رول دیا۔ نرملا کے پاؤں ایسے تھرکے کہ ہر قدم پر نعرۂ تحسین بلند ہونے لگا۔ دو برس میں نرملا ایک جھونپڑے سے نکل کر ایک اچھے خاصے فلیٹ میں وارد ہو گئی۔ اس کے بعد نرملا کے پرستاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ حسن کے پجاریوں نے آگے بڑھ کر نرملا کا ہاتھ تھامنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ماں نے سوچا ابھی تو لکشمی کی ابتدا ہوئی ہے۔ ان حالات میں نرملا کا کسی ایک دل پھینک عاشق کے ساتھ وابستہ ہو جانا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی اور نرملا بھی تو اپنی ماں کی بیٹی تھی۔ جذبات کی رو میں بہنا بے وقوفی ہے۔ 'ابھی ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے۔ روپے کی بہتات نے عقل پر تالا لگا دیا۔ ایک نئے عاشق جانباز نے کہا ——— "سندری! اپنا کل جسم میرے لئے وقف کر دو اور میرے سوا کسی اور کو نہ دیکھو۔" یہ نیا عاشق ماتھے پر تلک لگاتا تھا اور ریشمی دھوتی پہنتا تھا۔ مرغ اور مچھلی نہ کھاتا مگر نوعمر لڑکیوں کے پیچھے ایسے بھاگتا جیسے گھوڑا ریس میں بھاگتا ہے اور ہر حالت میں فرسٹ آنے کی کوشش کرتا۔ گو پنڈت ہر چرن عمر رسیدہ تھے۔ سر کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے، خضاب لگا کر عالم شباب کے مزے لیتے۔ مگر بڑھاپے میں جوانوں سے سبقت لینے کی کوشش کرتے۔ جب کسی لڑکی کو دل دے بیٹھتے تو پھر روپے پیسے کی پروا نہ کرتے۔ جس کو محبوبہ کہہ دیا اس کی ہر مانگ کو پورا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے۔ نرملا کو دیکھتے ہی کہنے لگے کہ تمہیں ہیروئن بنا دونگا اگر تم باقی عاشقوں سے

آنکھیں پھیر لو۔ نرملا اور اس کی ماں مان گئی۔حسن کے پجاری نے اپنی پوری پونجی ایک فلم بنانے میں لگا دی۔ ماں، باپ، بیوی بچوں کی پرواہ نہ کی کہ کل ان کا کیا ہوگا۔ اجی جہنم میں جائیں سب اپنی خواہش کے آگے۔ باقی سب باتیں بیکار تھیں۔ اس دنیا میں انسان بار بار تھوڑے ہی آتا ہے۔ "پریم کی گنگا بہاتے چلو ـــ"
فلم بنی اور لگی۔ فیل ہو گئی۔ نرملا نے جس نے ہیروئن بننے کے بعد، بڑے بڑے خواب دیکھے تھے۔ آن واحد میں ان خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھا۔ ہرچرن اپنا پورا اثاثہ یہ فلم بنانے میں لٹا چکے تھے، دوستوں اور رشتے داروں نے لعنت ملامت کی۔ مگر ان کا کردار نہ بدلا۔ کہیں سے روپے ملتے تو سیدھے نرملا کے گھر کی طرف رخ کرتے۔ نرملا ہارے ہوئے جواری کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھتی اور ایک دو مسکراہٹیں اور ادائیں دکھا کر نکل جاتی۔ ہارا ہوا جواری ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اس کا فرادابت کی بیوفائیوں کی تاب نہ لا کر راہی ملک عدم ہوا۔

ان تین چار برس میں نرملا کی شکل اور شباب میں کچھ تبدیلیاں سی آگئیں۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا اثر صورت اور جسم پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ معصومیت اور پاکیزگی، جو اس کے چہرے سے عیاں تھی، رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔حسن اور شباب کا تیکھاپن غائب ہو گیا۔ اور اس کی جگہ چہرے پہ ایک کرختگی سی آ گئی۔ جسم پر گوشت کی ایک تہہ، کا اضافہ ہو گیا۔ اس میں وہ رعنائی اور کشش نہ رہی۔ پھر بھی تیور وہی تھے۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ بمبئی میں بے وقوفوں کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ نرملا بھی موقعے کی تلاش میں تھی۔ کوئی ایسا حسن کا پجاری مل جائے جو دادِ حسن بھی دے اور پوری قیمت بھی۔ ادھر جو عاشق آئے وہ باتونی اور گپی نکلے۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ پھر چھ آٹھ مہینے کھلا پلا کر آگے بڑھ جاتے اس لئے وہ تمام آرزوئیں اور تمنائیں جو ابھی تک پروان نہ چڑھی تھیں، ابھی تک نگاہوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

انہیں دنوں جواد علی پھر آ دھمکا۔ یہ کمبخت کہاں سے آن ٹپکا۔ جواد علی کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ جسم فربہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا دل لاہور میں نہ لگا اور اس نے ان کے چلے جانے کے بعد بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں کی مٹی اسے خوب راس آئی۔ وہی سیمنٹ اور چونے کا بیوپار۔" ماں جی ایسا رنگ جما کہ روپیوں کا انبار

لگ گیا۔ آپ کی دعا سے دو اور شادیاں کرلی ہیں۔ یعنی اب کل تین عدد بیویاں ہیں اور مبلغ آٹھ عدد بچے سب بیویوں کو الگ الگ مکان لے دیئے ہیں۔ مزے سے کھاتا ہوں، کاریں سیر کرتا ہوں اور بنک بیلنس دن بہ دن بڑھ رہا ہے۔ آپ کی دعا سے پہلے بھی کسی بات کی کمی نہ تھی اور اب بھی نہیں۔" جواد علی نے کمرے میں نگاہ ڈال کر کہا ——"نرملا کہاں ہے ماں جی؟"

"ذرا طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے ملنے گئی ہے۔" نرملا کی ماں نے جواب دیا۔

شاید نرملا کی کمی تھی جسے جواد علی نے شدید طور پر محسوس کیا تھا۔ پھر جواد علی نے اٹھتے ہوئے کہا —— "ماں جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیے گا۔ بس اپنا بچہ سمجھ کر حکم دیجئے۔ اگر آپ کی فرمائش پوری نہ ہو تو لعنت ہے اپنی کمائی پر۔"

نرملا کی ماں نے محسوس کیا کہ چند برسوں میں سیٹھ جواد علی کافی ڈھیٹ اور منہ پھٹ ہو گیا تھا۔ روپے کی فراوانی نے اسے کافی بد اخلاق اور بے شرم بنا دیا۔ شاید یہ شہر ہی ایسا ہے۔ جو یہاں آتا ہے بڑی جلدی بے شرم اور بے غیرت ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ وہ خود بھی تو۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر چونکی۔

اتنے میں نرملا آگئی اور ماں نے سیٹھ جواد علی کا ذکر کیا۔

"ماں اس کا رنگ کیسا ہے؟"

"اس کا رنگ تو یہاں خوب چمکا ہے بیٹی! کاریں گھومتا ہے۔ نرملا مردوں کی رنگت کون دیکھتا ہے۔ ان کا تو بنک بیلنس دیکھا جاتا ہے!"

"سچ کہتی ہو ماں، پھر بھی مجھے اس شخص سے نہ جانے اتنی نفرت کیوں ہے؟ ایک بار تم نے صاف جواب دے دیا تھا۔ اب پھر۔۔۔"

"بیٹی! وہ آتا ہے تو ہم سے کچھ لے کے نہیں جاتا۔" پھر ماں نے نرملا کی طرف دیکھا۔ نرملا کی نفرت کو دیکھ کر خاموش سی ہو گئی۔ جواد علی کافی ضدی تھا۔ وہ کبھی کبھار چکر ضرور مارتا تاکہ ان کی مالی حالت کا پتہ چلتا رہے۔ ابھی تک مالی حالت اتنی بری نہ تھی کہ جواد علی اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ اب وہ دل کی بات اس وقت کہے گا جب اسے یقین ہو جائے گا کہ معاملہ پٹ جائے گا۔ ہر بار شکست کا منہ دیکھنا بھی کہاں کی عقل مندی ہے۔

اس طرح پانچ سال اور گزر گئے۔ نرملا کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہوئی بلکہ دگرگوں ہوتی گئی عشاق کی ایک لمبی قطار تھی۔ زیادہ تر عاشق کنگال اور باتونی نکلے۔ فلمیں بنانے کی سکیمیں کافی تھیں۔ روپیہ ندارد۔ بس گپیں ہانک کر اور چائے پی پی کر چلے جاتے۔

نرملا اس بات کی متلاشی تھی کہ کوئی گانٹھ کا پورا اور عقل کا اندھا مل جائے تو مستقبل سنور جائے۔ اسی دوران میں نیوی کا ایک افسر ملا۔ شراب پی کر نرملا کے گھر پڑا رہتا۔ شراب، کھانے پینے کے اخراجات، باہر کی تفریح، سینما، کپڑے سبھی کے لئے روپے دیتا مگر ان روپیوں سے زندگی تو نہیں بنتی۔ جب نرملا نے تنگ آکر شادی کے لئے کہا تو نیوی کا افسر اگلے دن رفو چکر ہو گیا اور پھر نرملا سے ملنے نہ آیا۔

کچھ اسی قسم کے چکروں میں نرملا نے اپنا حسن و شباب کھو دیا۔ حسن کو بڑی فراخ دلی سے لٹایا جس چیز کی لوگ قیمت ادا کرتے ہیں اسے سنبھال کر نہ رکھا۔ وہ محرابوں اور قوسوں کا تاج محل ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔ اب بھولے بھٹکے مسافر آتے اور کھنڈر کو دیکھ کر کہتے۔ عمارت ضرور عظیم ہو گی۔

یہ وہی لمحات تھے جب نرملا نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر سوچا کہ زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ اب تو سہارے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں جواد علی پھر وارد ہوا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو بھانپ لیا کہ اب سب پنچھی اڑ گئے۔ شمع حسن بھی بجھی بجھی سی ہے جس تمکنت اور رعب داب سے نرملا بات کرتی تھی اس کی جگہ نرمی اور التجا نے لے لی۔ جواد علی نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ وہی خوشامدانہ اندازِ گفتگو رہا۔ دلِ بے تاب کی دھڑکنوں کو اپنے تلک محدود رکھا۔ یہ پرانا عاشق بڑا ہی خود سر اور ضدی تھا۔ ظاہری نرمی تلے ——— استقامت، مضبوطی اور توانائی کی تہہ تھی۔ وہ دل کی بات کہہ کر دوبارہ رسوا نہ ہونا چاہتا تھا۔ بس ماں جی سے کہتا ——— "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے۔ اللہ کی مہربانی سے میرا کاروبار خوب چمکا ہے۔ اگر میں آپ کے کام آسکوں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ چلئے ذرا آپ کو باہر گھما لاؤں۔"

اس دن نرملا اور اس کی ماں کار میں بیٹھ کر باہر چلی گئیں۔ واپسی پر جواد علی نے نرملا کو کچھ چیزیں خرید دیں اور جب نرملا گھر میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں جواد علی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ

جواد علی کی پہلی فتح تھی۔

اب ہر دوسرے تیسرے دن جواد علی اپنی کار لے کر آجاتا۔ نرملا کی ماں جو فرمائش کرتی جواد علی پوری کرتا۔ نرملا دل ہی دل میں کڑھتی، لڑتی۔ پھر ماں کے کہنے پر سیٹھ جواد علی کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جاتی۔ دونوں جوہو پر سیر کرنے نکل جاتے۔ میرین ڈرائیو پر کار فرّاٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی۔ نہ جانے اس تمام عرصے میں نرملا میں یہ اچانک تبدیلی کیسے آئی کہ اسے جواد علی اچھا لگنے لگا جس کالے رنگ کو دیکھ کر وہ منہ پھیر لیتی تھی وہی کالا رنگ اسے بھا رہا تھا۔ کیا یہ روپیوں کا جادو تھا یا جواد علی کے خوشامدانہ طرزِ گفتگو کا اثر یا آنے والی زندگی سے بچنے کے لئے اس نے یہ راہ اختیار کی تھی۔ اب زندگی کو سنوارنا ہے تو سنوار لو۔ ادھر جواد علی پر یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ رات کی برانی راہ راست پر آ رہی ہے جواد علی نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا اور ساتھ ساتھ نرملا کو اس کے مستقبل کے متعلق اشارے کرتا رہا۔ "موقع ہے اپنی زندگی بنالو۔ میں تو تیرا پرانا عاشق ہوں جنم جنم کا ساتھی۔ لاہور میں تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو اس وقت صرف ایک شادی کی تھی۔ تمہارے فراق میں دو شادیاں اور کر لیں لیکن تمہیں پانے کے جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں وہ مجنوں نہیں کہ گریباں پھاڑ کر صحرا صحرا، جنگل جنگل گھوموں۔ تمہیں پانے کی تمنا ضرور رہے اور جب تک زندہ رہوں گا تمہیں پانے کے لئے میرا دل تڑپتا رہے گا۔ اس بے پایاں محبت ——— کے علاوہ دن رات محنت کرتا ہوں۔ اپنی تین بیویوں کو پالتا ہوں۔ اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہوں، دوستوں کی مدد کرتا ہوں، غریبوں میں روپے تقسیم کرتا ہوں۔ کافی بزنس بڑھا لیا ہے۔ تم میری چوتھی بیوی ہوگی اور میری آخری بیوی ——— نرملا بدصورت ضرور ہوں مگر دل کا بڑا خوبصورت اور قسمت کا دھنی ہوں۔ نرملا مجھ سے شادی کر لو زندگی بڑے مزے سے کٹے گی۔ تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں۔ اب زیادہ نہ تڑپاؤ۔ ہاں کر دو تو سب سے پہلے نیا فلیٹ خرید کر دوں گا۔ نئے فرنیچر سے ایسا سجا دوں گا کہ بمبئی کی تمام عورتیں عش عش کر اٹھیں۔ ان دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ سے باہر نکلو اور ایک خوشگوار اور باوقار زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اور نرملا جو آج سے دس سال پہلے سیٹھ کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی تھی آج اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ سوچ رہی تھی وہ کیا جواب دے۔ آج سے دس سال پہلے اس کے خون کا ایک

قطرہ بھی اس شخص سے ہم کلام ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر آج قسمت الٹا فیصلہ کر رہی تھی۔ ہاں وہ بازی ہار گئی تھی۔ گاڑی پٹڑی سے اتر گئی تھی کیونکہ جواد علی کے ان تمام فقروں کو سن کر دل نے ملامت نہ کی۔ ذہن نے بغاوت نہ کی۔ بس یہی کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ شاید درست ہو رہا تھا۔ اس عرصے میں نرملا نے جو فرمائش سیٹھ سے کی جواد علی نے اسے پورا کیا اور یہ مانگیں اس طرح پوری کیں کہ سیٹھ کی گرفت نرملا پر مضبوط ہوتی گئی۔ وہ سنہرے سپنے جن کی چھاؤں میں اسے نیند آنے لگی تھی، وہ سپنے اب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ وہ سب کچھ کرے گی۔ وہ اپنا نام تک بدل دے گی۔ مذہب میں کیا رکھا ہے۔ نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے، وہ مندر کب جاتی ہے کہ اب مسجد میں جائے گی۔ ہاں ایک بہتر زندگی گزارنے کے لئے وہ ہر روایت کو توڑ دے گی اور جو کچھ سیٹھ کہے گا کرے گی۔ وہ بھوکی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ان دو کمروں میں رہنا نہیں چاہتی۔ وہ یوں ٹراموں اور بسوں میں گھومنا نہیں چاہتی۔ اب تو کار کا چسکا بھی پڑ گیا تھا۔ پھر ایک دن وہ چپکے سے مہر النساء بن گئی اور سیٹھ کے نئے فلیٹ میں وارد ہوئی۔ سیٹھ نے واقعی اس مکان پر اچھی خاصی رقم خرچ کی تھی۔ بہترین فرنیچر سے فلیٹ کو سجایا تھا۔ اب سیٹھ جواد علی مہر النساء کے ساتھ رہنے لگا۔ تقریباً چھ ماہ تو خوب گزرے اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ مہر النساء نے سوچا تھا کہ اس نے اتنی بڑی قربانی کر کے سیٹھ کو جیت لیا ہے لیکن مسلسل لڑائیوں سے یہ بات مہر النساء پر عیاں ہو گئی کہ سیٹھ بھی مجموعہ اضداد ہے۔ کمبخت کسی بیوی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے دل میں ہر بیوی کی جگہ ہے۔ وہ آٹھ دن میں دو راتیں اس کے ہاں گزارتا اور باقی چھ راتیں دوسری بیویوں کے پاس۔ مہر النساء نے ہر حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا۔ رات رات جاگ کے دیکھ لیا۔ فاقے کر کے دیکھ لیا۔ گھر میں ہنگامہ کر کے دیکھ لیا مگر سیٹھ جواد علی کے رویے اور سلوک میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ سیٹھ نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا۔ "تو مجھے قید کرنا چاہتی ہے یہ کبھی نہ ہوگا۔ تمہاری ضد مجھے جبوران نہیں بنا سکتی۔" اب مہر النساء کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ شخص ایک عورت کا ہو کے نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص آوارہ اور بدمعاش ہے۔ اس نے اپنے من کی خوشی کے لئے مجھ سے شادی کی تھی تاکہ اپنی برسوں پرانی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے اور جب اس کی خواہش کی تکمیل ہو گئی تو سیٹھ نے اصلی روپ دکھا دیا۔

اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے گلہ کرے؟ کس سے شکایت کرے؟ یہ کوئی میاں اور بیوی کی زندگی نہ تھی محض آقا اور غلام کا رشتہ تھا۔ وہ دن بھر انتظار کرے۔ کیوں انتظار کرے؟ محض دو وقت

کھانا کھانے کے لئے۔ لوگوں کو سجا ہوا فلیٹ دکھانے کے لئے۔ اور سیٹھ جواد علی کا جہاں جی چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ کئی دن گھر سے غائب رہتا ہے۔ جانے اس وقت کس بیوی کے پاس ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کا خون جوش مارنے لگتا اور وہ بڑبڑانے لگتی۔ اس بار تو سیٹھ پانچ دن کے وقفے کے بعد گھر آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مہرالنسا نے سیٹھ کو گریبان سے پکڑ لیا۔ سیٹھ نے جوابی حملہ کیا اور دو تین تھپڑ رسید کئے۔ وہ چیخی چلائی۔ اس نے دو چار لاتیں جمادیں۔ اُس دن تو مار برداشت کر گئی۔ اس کے بعد تو تقریباً جب کبھی اس نے کوئی شکایت کی جواد علی فوراً دو چار گندی گالیاں دیتا اور ایک دو تھپڑ رسید کرتا اور ساتھ ہی کہتا ——— "عورت کے مزاج کو ٹھیک رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے ہر روز پیٹا جائے" ہائے اس جواد علی کو کیا ہو گیا۔ بیاہ سے پہلے اس نے کبھی جھڑکا تک نہ تھا۔ چاپلوسی کرتے کرتے اس کی زبان تھک جاتی تھی۔ اب تو ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ اس شخص نے اس کی جوتیاں اٹھائی تھیں! وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اس گھر میں رہی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مارپیٹ، یہ گندی گالیاں، یہ وحشیانہ سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ شخص اپنے آپ کو سدھار نہیں سکتا۔ ان حالات میں وہ اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ دراصل ہم دونوں کا مزاج نہیں ملتا۔ دونوں کی سوچ سمجھ کی راہیں مختلف ہیں۔ یہاں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اگر چند دن اور ٹھہر گئی تو پاگل ہو جائے گی اور پھر ایک دن فیصلہ کر کے وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی آئی کر دوبارہ جواد علی کے گھر نہ جائے گی۔

وہ اپنی پرانی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماہ و سال اس کی نگاہوں کے سامنے گزرنے لگے۔ پرانی یادیں۔ جب وہ صرف پندرہ برس کی تھی تو جواد علی لاہور میں ملا تھا۔ پانچ سال گزرنے کے بعد وہ بمبئی چلی آئی۔ یہیں پر عاشقوں کا ایک قافلہ ملا۔ اسی طرح پانچ برس اور گزر گئے۔ سیٹھ جواد علی پھر آیا۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ سیٹھ کے ساتھ شادی کی۔ شادی کے بعد نفرت، بیزاری اور علیحدگی۔ کھڑکی میں بیٹھے ہوئے ۵۵۵ کے ہندسے اس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہے تھے کیونکہ اس کی زندگی میں ہر پانچ برس کے بعد ایک اہم تبدیلی ہوتی رہی اور آج اس جگہ پر پہنچ گئی تھی جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔



خدیجہ مستور

بھروسا

سارا جون بارش کے ایک قطرے کے بغیر گزر گیا تھا مگر آج صبح بڑے زور کی آندھی چلی اور پھر ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل کر گئی۔ احاطے کے بچوں نے کپڑے اتار کر پانی میں چھپاچھپ شروع کر دی۔ جسموں پر جما ہوا میل پھول گیا تھا۔ جون کی گرمی میں پھنکتے ہوئے جسم ٹھنڈی کیچڑ میں لوٹیں لگا رہے تھے۔

بارش رکی تو عورتیں بالٹیاں اور گھڑے اٹھا کر ہینڈ پمپ کی طرف لپکیں۔ صبح سے سارا کام پڑا تھا۔ وہ سب جلدی میں تھیں اور ہر ایک یہی چاہ رہی تھی کہ پہلے وہ پانی بھرے۔ کئی کئی بالٹیاں اور گھڑے بیک وقت ہینڈ پمپ کی ٹونٹی سے ٹکرا رہے تھے۔ مگر اس تیزی کے باوجود وہ سب کچی چھتوں کے ٹپکنے، سامان کے بھیگنے اور بارش سے ڈری ہوئی لکڑیوں کے چیخنے کی باتیں کر رہی تھیں۔ کوارٹروں کی مالکن کی بھی برائیاں ہو رہی تھیں جو کرایہ لینے کے بعد بھی چھتوں پر مٹی نہیں ڈلواتی تھی۔ باتوں کے درمیان جب بچے عورتوں کی طرف کیچڑ اچھال دیتے تو دو چار سڑی سڑی گالیاں بھی ہو جاتیں۔

اور عین اسی وقت جب کہ سب پانی بھرنے اور باتوں میں مصروف تھیں نورضیہ ریڑھے پر اپنا سامان لادے آگئی۔ ریڑھے کے پہیے کیچڑ اچھالتے احاطے میں آکر رک گئے، تو سر سے

پاؤں تک بھیگی ہوئی رضیہ نے اتر کر سب سے پہلے اپنی بیٹی کو اتارا اور پھر اپنا دوپٹہ نچوڑ کر جلدی سے اوڑھ لیا۔ کوچوان سامان اتارنے لگا تو رضیہ اس کی مدد کرنے لگی۔

پانی بھرنے والیاں اپنی بالٹیاں اور گھڑے ہینڈ پمپ کے پاس چھوڑ کر نئے کرایہ دار کو دیکھنے کیلئے جمع ہو گئیں۔ اس وقت انہیں ذرا بھی جلدی نہ تھی۔

"ہے بہنا،" رضیہ جلدی سے کہنے لگی "صفدر رات آکر کوارٹر دیکھ گیا تھا۔ کہتا تھا کہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ تیرا جی لگا رہے گا۔ اس وقت دہاڑی کرنے گیا ہوا ہے۔ کہتا تھا کہ رات کو آکر آپ ہی سامان لے جاؤں گا۔ تو مت لے جائیو نہیں تو تھک جائے گی۔ راستے میں تھی کہ بارش آگئی۔ چلو نہالی۔ اب اگر طبیعت خراب ہوئی تو وہ غصے ہوگا۔" وہ بڑے پیارے پن سے ہنسی "غصے ہوگا تو کیا، وہ کبھی تو شام تھکا ہوتا ہے۔" رضیہ نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر اپنی پڑوسنوں سے یوں گلے ملنے لگی جیسے مدتوں سے جانتی ہو۔ "اری بہنا یہ تو نے بچے کا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میں بتاؤں تو روز اسے صبح کے وقت ذرا سا مکھن کھلایا کر۔ صفدر اسی طرح کرتا تھا تو میری صفیہ یہ موٹی تھی۔ اسے گود میں اٹھانے پر شرطیں لگا کرتیں۔ سب کی کمر ٹیڑھی ہو جاتی۔"

اچھا! شاداں پٹھانی نے رضیہ کے گلے سے الگ ہوتے ہوئے حیرت سے دبلی پتلی صفیہ کو دیکھا جو زمین پر بیٹھی گیلی مٹی کھرچ کھرچ کر ہتھیلیوں سے سویاں بٹ رہی تھی۔ شاداں نے اطمینان کی سانس لے کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور پشتو زبان میں رضیہ کو ایک موٹی سی گالی دے کر ہنسنے لگی۔

پندرہ سال سے غریب لاہور ہی میں رہ رہی تھی۔ دوسروں نے تو اس کی زبان سیکھ کر نہ دی مگر وہ اب اکھڑی اکھڑی پنجابی اور اردو بولنا سیکھ گئی تھی۔ اپنی زبان تو اب صرف دل کا غبار نکالنے کیلئے ہی بولا کرتی۔

"پر ماسی تیری کمر تو اب تک سیدھی ہے۔" پیلو نے ہنس کر کہا اور سب زور سے ہنس پڑے۔ پیلو بیچاری کو یوں تو کوئی مشکل ہی سے منہ لگاتا مگر وہ ہنس بول کر آپ ہی سب کے منہ لگے جاتی۔ عیسائی ہونے کی وجہ سے اسے سب ہیٹا سمجھتے۔ اس پر ستم یہ کہ اس کا ابا سڑکوں پر جھاڑو دینے کا کام کرتا تھا۔

"اری تو کوئی ہمیشہ کے لئے کمر تھوڑی ٹیڑھی ہو جانی تھی۔" رضیہ نے ذرا بگڑ کر جواب دیا اور کوٹھری کا تالا کھول کر سامان میں بندھی ہوئی جھاڑو نکالنے لگی۔ "صفدر کے لئے کھانا بھی تو پکانا ہے بہنا، ابھی پکا لوں گی۔ نہیں تو پھر آ کر کام نہ کرنے دیگا۔ کہے گا تو تھک گئی ہوگی سامان باندھ کر۔"

شاید اس کی بات کسی نے سنی ہی نہیں کیونکہ سب کی نظریں اس کے سامان کو ٹٹول رہی تھیں۔ موٹے موٹے پایوں والی بے ڈھنگی سی مسہری۔ نیا چمکتا ہوا ٹرانزسٹر، دو بکس پھٹلی سے بندھا ہوا بستر، برتنوں کی بوری، ایک میز اور ایک کرسی۔ بانس کی دو کھاٹیں جن کے پرانے بان ٹوٹ کر لٹک رہے تھے۔

ایسے شاندار سامان کو دیکھ دیکھ کر عورتوں کی آنکھیں حیران ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے کوارٹروں میں تو کھاٹوں، بستروں اور برتنوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

"ریڈیو تو بجا ماسی"۔ پیلو نے ہمک کر فرمائش کی۔

"لے میں کیا جانوں بجانا، تیرا بھائی آئے گا تو بجائے گا۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ مت خرید مگر زبردستی لے آیا کہ تو گانے سنے گی تو پھر اکیلے میں جی نہ گھبرائے گا۔" رضیہ بڑے غرور سے ہنسی۔

"لو بہنا اب میں کام کر دوں۔ میری لڑکی بھی بھوکی ہو گی۔ سب سامان بھی رکھنا ہے۔" رضیہ جھاڑو لے کر کوٹھری کے اندھیرے میں ڈوب گئی اور منٹوں میں کوٹھری سے دھول کا بادل اٹھنے لگا۔

عورتیں ہینڈ پمپ کی طرف پلٹ گئیں۔ دن کے کوئی دس گیارہ بج رہے تھے مگر بادلوں سے لدے پھندے دن نے وقت گزرنے کا احساس ختم کر دیا تھا۔ عورتیں اب بڑی پھرتی سے گھڑے اور بالٹیاں اٹھا اٹھا کر اپنے کوارٹروں میں جا رہی تھیں۔ بس ایک پیلو تھی جو سب کچھ بھول بھال کر ایک ساں ٹرانزسٹر کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ اس کے لئے یہ بات کس قدر اچنبھے کی تھی کہ اب وہ اپنے احاطے میں گانے سن سکے گی۔ ویسے تو گانے سننے کے لئے تیری میری کوٹھیوں کے چکر لگانے پڑتے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لئے بیگمات کے بیسوں کام مفت میں کرنے پڑ جاتے۔

سامان سلیقے سے لگا کر رضیہ نے کوٹھری کے باہر بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور پھر پیلے پھولدار

دسترخوان میں بندھی ہوئی روٹیاں کھول کر صفیہ کے ساتھ کھانے بیٹھ گئی" تمیز سے کھا، کہا۔
نہیں۔ لوگ کہیں گے چوڑے چمار کی اولاد ہے"۔ اس نے خواہ مخواہ صفیہ کو ڈانٹ دیا اور اس
ننھی سی جان پر اس ڈانٹ کا ایسا اثر ہوا کہ بلک بلک کر رونے لگی۔ رضیہ نے بڑی مشکلوں سے
اس کو سینے سے لگا لگا کر چپ کرایا اور پھر دل ہی دل میں کوسنے لگی۔ ارے اماں تیری اولاد بھی
اللہ کرے قطرہ قطرہ محبت کو ترسے۔ میرا تو کچھ نہ بگڑا پر تو لونڈیا کو بن باپ کا کر گئی۔

کھانے کے بعد وہ مسہری پر تھکی تھکی سی لیٹ گئی۔ صفیہ کو اپنے پہلو میں لٹا لیا اور ایکبار
پھر اسے پیار کرنے لگی۔ مگر صفیہ اس محبت سے اکتا کر ایک ساتھ کسمسائے جا رہی تھی۔ اس کا
کیسا جی چاہ رہا تھا کہ باہر نکل کر سب میں شامل ہو جائے۔

"نہیں سونا تو پھر باہر جا کر کھیل آ"، رضیہ نے بڑے پیار سے کہا۔ صفیہ کو ڈانٹ کر اب
تک اس کا دل ہل رہا تھا۔ اسے گزرے ہوئے دن یاد آرہے تھے۔ اگر صفیہ نہ ہوتی تو وہ
بھول کر بھی ان دنوں کو یاد نہ کرتی۔ صفدر کے ہوتے آخر اسے کس بات کی کمی ہے۔ صفیہ
کو تو وہ اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہے۔ رضیہ نے صفیہ کے جانے کے بعد اپنے دل کو تسلی دی اور
پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر آج تو صفیہ کو ڈانٹنے کے ساتھ ہی اسے صفیہ
کا باپ اور اپنی ماں سب یاد آنے لگے تھے۔ ماضی کی دھول نے اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔

اماں باوا کی چھوٹی بیٹی اور آخری دسویں اولاد ہونے کی وجہ سے سب نے اس کی
پیدائش پر لعنت بھیج دی تھی۔ سب نے اس کی موت کی دعائیں مانگیں مگر وہ بڑی ڈھٹائی
سے جیے چلی گئی۔ اماں باوا کے گھر اسے کبھی پیٹ بھر روٹی نہ ملی۔ کبھی کوئی پیار سے نہ بولا جب
اماں نے باری باری اپنی پانچوں بیٹیوں کو لوٹا کٹورا اور ایک ایک جوڑا دے کر دوسرے
گھروں میں رخصت کر دیا تو وہ مارے دکھ کے بہت روئی تھی۔ دس سال کی عمر میں اسکی
خواہش تھی کہ پہلے اسے رخصت کیا جاتا۔ بڑی بہنیں جب کبھی کبھار مائیکے آتیں تو آپس میں
اپنے میاؤں کی محبت کا ذکر کرتی رہتیں۔ ایسی ایسی باتیں بتاتیں کہ رضیہ کے حواس گم

ہو جاتے۔ پھر وہ بتائیں کہ ان کے میاں تو صرف ان کی خاطر ایک وقت گوشت پکواتے ہیں تو وہ سچ مچ چیخ پڑتی۔ گوشت کا ذائقہ اور محبت کی بو سونگھ کر وہ اپنی بہنوں کو گالیاں دینے لگتی۔ "جھوٹیاں حرام زادیاں" اسے تو نہ کھانے کو بوٹی ملتی نہ جینے کو محبت۔ بھائی چوٹی پکڑ پکڑ کر مارتے۔ ماں ہر وقت کوستی رہتی کہ کتنے بلی کی آئی ہوئی موت اسے سمیٹ لے جائے۔ گھر سے بھاگ کر وہ پڑوس میں پناہ لیتی۔ اب پڑوس میں کون فالتو تھا جو اس کے سر پہ ہاتھ رکھتا۔ اسے کلیجے سے لگاتا۔ پڑوسنیں اسی وقت پیار سے بولتیں جب انہیں اپنے بچوں کے پوتڑے دھلوانے ہوتے۔ انکار کرتی تو وہ بھی دھکے مار کر نکال دیتیں کہ جا اپنی ماں کے کولہے سے لگ کر بیٹھ۔

چودہ سال کی ہوئی تو اماں نے رو رو کر اور کوس کوس کر لوٹے کٹورے کا انتظام کر کے اپنے حساب اسے دوسرے گھر ڈھکیل دیا۔ مگر رضیہ کو تو جیسے جنت مل گئی۔ شوہر نے اسے بتایا کہ اس کا مکھڑا چاند سا ہے۔ وہ رضیہ کے قدموں کا غلام ہے اور اگر وہ اس کی محبت سے ہٹ کر چلے تو وہ خدا کا گنہگار ہو۔ ایسی باتیں سن سن کر رضیہ مارے حیرت کے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہ آتا کہ وہ جو چڑیل صورت تھی اس کا چاند سا مکھڑا ہے اور جسے سب نے اپنے قدموں تلے روندا اس کے قدموں کا بھی کوئی غلام ہو سکتا ہے اور جب اسے ان سب باتوں کا یقین ہو گیا تو اسے ایسا لگا کہ وہ مارے غرور اور خوشی کے ہوا میں اڑ رہی ہے۔ صبح اس نے اپنی نندوں کو بتایا کہ ان کا بھائی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ پھر بغیر بلوائے وہ اماں کے گھر بھاگی بھاگی گئی اور لہک لہک کر سب کو میاں کی انتہائی محبت کا حال سنایا۔ بہنیں جو اس کی شادی میں شریک ہونے آئی تھیں اور اب ازدواجی زندگی کے کئی سال گزارنے کے بعد باسی دال ہو چکی تھیں، کڑھ کر رہ گئیں۔ مگر رضیہ کی بھاوج نے تو مارے جلن کے اس کے افشاں سے بھرے ہوئے بال ہی کھسوٹ ڈالے۔ وہ روتی سسکتی اور سب پر لعنت بھیجتی اپنے گھر واپس آ گئی۔ رات اس نے رو رو کر اپنے میاں کو حال سنایا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اسی وقت باہر نکل گیا اور سسرال کے دروازے پر کھڑے ہو کر سب کو بے نقط سنائیں کہ کسی کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پھر گھر آ کر رضیہ سے قسم لی کہ اب کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھے گی۔

رضیہ سارا دن میاں کا کلمہ پڑھتی۔ پیروں کا غلام دنیا سے بے خبر تھا اور ساس نندیں

کے کلیجے دکھ سے پھٹے جا رہے تھے۔ ماں بیٹے کو چھیننے اور بہنیں بھائی کو پانے کے لئے ہر وقت چوکس رہنے لگیں۔ ان کی زبانیں دو دو ہاتھ لمبی ہو گئیں۔ مگر جب اس کا شوہر رضیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھتا تو ماں بہنوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ اور اس وقت رضیہ کا جی چاہتا کہ اس کی ساس نندوں کی زبانیں اور لمبی ہو جائیں۔ مارے غرور کے رضیہ سیدھی طرح نہ چل سکتی۔ سال مزے سے گزر گیا مگر یوں کب تک ہوتا۔ آخر ماں بہنوں کی بن آئی۔ روز کی لٹ کٹ سے شوہر بھی اکتا گیا تھا۔ اپنے پالنے والی سے کب تک منہ موڑتا۔ آخر یہ بھی تو گناہ تھا۔ ایک دن جو رضیہ نے ساس کی شکایت کی تو اس نے اسے خوب پیٹا۔ پہلے تو رضیہ کو اپنے پٹنے کا یقین ہی نہ آیا۔ مگر جب روز یہی عمل ہونے لگا تو رضیہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے غرور کے پر ٹوٹ گئے۔ وہ ہوا میں اڑتے اڑتے دھم سے نیچے گر گئی۔ وہ سسک سسک کر رو بیٹھی مگر اب اسے کون سینے سے لگاتا۔ انہیں دنوں رضیہ کے پیٹ میں صفیہ کلبلانے لگی اور اس کا شوہر راتوں کو غائب رہنے لگا۔ اب ساس نندوں نے اسے نہتا دیکھ کر بڑی محبت سے غمخواری شروع کی۔ رضیہ کے غم میں ساس نندوں نے گھر کے کام سے منہ موڑ لیا اور رضیہ ان کی محبت کی قائل ہو کر سارا دن گھسٹ گھسٹ کر کام کرتی پھری۔ شوہر گھر آتا تو اسے دیکھ کر وہ کونوں کھدروں میں منہ چھپا کر روتی پھرتی۔ کسی کو ہمیشہ کے لئے محبت کے جذبے سے ناواقف رکھا جائے تو شاید یہ جرم نہیں مگر کسی کو محبت دے کر چھین لینا سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کا رواں رواں چیختا رہا، ارے ظالم مڑ کر تو دیکھ۔

صفیہ کی پیدائش پر تو رضیہ بالکل ہی ویران ہو گئی شاید لڑکے کی پیدائش پر اپنی محبت کو لوٹا سکتی۔ اب تو اس گھر سے اس کا دل بالکل ہی اچاٹ ہو گیا۔ چھلا نہا کر اٹھی تو زیادہ وقت گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیتی۔ انہی دنوں صفدر نے اس کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ پھر ہوتے ہوتے اس نے صفیہ کے آنسو پونچھنا شروع کئے۔ اور رضیہ اپنے کو سنبھالنے کے باوجود صفدر کی محبت میں کھو گئی۔ کیسی عجیب اور کتنی بھرپور محبت۔ عاشق کی محبت کے جوش خروش کا تو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے پھر سے پر مل گئے۔ اس نے ایکبار پھر سب کی طرف غرور سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ جی ہی جی میں صفدر کی باتیں نہ بتا سکنے پر گھٹتی رہتی۔ لیکن ایک دن وہ اپنی ساس کی گالی

کے جواب میں صفدر سے جوتے لگوانے کی دھونس جما ہی بیٹھی۔
اس بات پر سب نے مل کر رضیہ کی خوب مرمت کی اور پھر اس کے شوہر نے طلاق دے کر اسے گھر سے نکال دیا۔ اور صفدر کی کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازوں نے اسے اپنی گود میں چھپا لیا۔
عدت کے دن پورے ہونے کے بعد صفدر نے بڑی دھوم سے رضیہ کو بیوی بنا کر سب کے اس خیال پر تھوک دیا کہ وہ تو نکاح سے پہلے چھوڑ دے گا۔ شادی کی خبر سن کر رضیہ کی پرانی ساس نندیں کوٹلوں پر لوٹتی رہیں اور جانے کیوں اس کا شوہر اپنی ماں بہنوں پر غصّے ہو ہو کر سارا دن گھر پر پڑا رہا۔

الجھ کر رضیہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر صفیہ کو دیکھنے کے لئے کوٹھری سے باہر نکل آئی اور کھڑے ہو کر اسے گیلی مٹی کا گھروندا بناتے دیکھنے لگی۔
زمین سے اب تک بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی اور گہرے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے ہوا میں ڈولتے پھر رہے تھے۔ کوارٹروں کی چھتوں پر چڑھی ہوئی عورتیں بارش سے بھیگی ہوئی لکڑیاں اور اپلے اتار اتار کر نیچے پھینک رہی تھیں اور بچے انہیں اٹھا اٹھا کر کوٹھریوں میں پہنچا رہے تھے۔ گھنے درختوں تلے کھاٹیں پڑی تھیں جن پر بوڑھیاں بیٹھی حقہ گڑگڑا رہی تھیں۔ کوارٹروں کی چھتوں کے اس پار شاندار کوٹھیوں کے اوپری حصّے صاف نظر آ رہے تھے۔ سرخ ہری اور بادامی رنگوں کی دیواروں پر بارش نے دھاریاں بنا دی تھیں۔
رضیہ ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی اور پھر اپنی کوٹھری میں تالا لگا کر ساتھ کے کوارٹر میں چلی گئی۔ اندر ایسا اندھیرا تھا کہ اسے ایک دم کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب ذرا آنکھ ٹھہری تو دیکھا کہ ایک دبلی پتلی عورت پیڑھی پر بیٹھی روٹی کھا رہی ہے۔ "میں نے تجھے تو دیکھا ہی نہیں۔" رضیہ نے بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔
"میں پردہ کرتی ہوں۔" عورت نے نوالہ نگلتے ہوئے جواب دیا۔
"واہ جی پالک کا ساگ، اے بہنا میں تو جب تک پالک کا ساگ نہ کھاؤں چین نہیں پڑتا۔"

رضیہ نے جلدی سے نوالہ توڑ کر کھانا شروع کر دیا۔

عورت نے بڑی بے زاری سے اس کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کھانے پر جٹ گئی۔ یہی توکل دو روٹیاں تھیں۔ اس پر حصہ بٹانے آگئی۔ پنجابی جان پڑتی ہے۔ اس نے سوچا ان لوگوں کو ذرا تمیز نہیں ہوتی۔ ایک تو زبان کے بجائے ہاتھ سے بات کریں اس پر یہ ظلم کہ سارے ہندوستانی کہہ کر پکاریں ـــــ اس کا بس چلتا تو رضیہ کے ہاتھ سے روٹی چھین لیتی۔ اسے تو سچ پوچھو پنجابیوں سے للّہی بغض تھا۔ سارا کچھ چھوڑ کر یہاں پاکستانی بننے آئی لیکن کسی نے نہ مانا۔ رہی ہندستانی ہی۔

"اری بہنا یہ بچہ کیوں بے سدھ پڑا ہے؟" آدھی روٹی چٹ کر کے رضیہ نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"بخار چڑھا ہے۔"

"ہے ہے اسے کونین کھلا۔ میرا صفدر تو گرمی شروع ہوتے ہیں مجھے اور صفیہ کو کونین کھلانے لگتا ہے۔ مچھر کاٹنے کا بخار ہوگا۔" اس نے اٹھ کر بچے کی پیشانی کو چھوا۔

"کون لائے کونین، میں تو باہر نکلوں نہیں۔ اس کا باپ صبح صبح کام پر چلا جاتا ہے۔"

"صفدر تو مجھے کبھی پردہ نہیں کراتا۔ کونین تو میں خود لا سکتی ہوں مگر ابھی تو مجھے دکانوں کا بھی پتہ نہیں۔ دو چار دن میں سب معلوم ہو جائے گا۔"

"لا اور کھالو دو نوالے۔" ہندوستانی کے دل پر اس محبت کا بیحد اثر ہوا۔

"بس بہنا اب نہیں کھانا۔ ہے کیسا تیز بخار چڑھا ہے غریب کو۔ راستہ معلوم ہوتا تو ابھی جا کر لے آتی۔ اب شام کو صفدر آئے گا تو اس سے منگا دوں گی۔"

"وہ لے آئیں گے؟" ہندستانی نے حیرت سے پوچھا۔

"لے بہنا، میں کہوں کہ صفدر ساری رات ایک ٹانگ سے کھڑا رہ تو کھڑا رہے گا۔" رضیہ ہنس پڑی۔ "کونین کیا چیز ہے۔" وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ "اب جا کر دیکھوں کہ صفیہ کہاں کھیل رہی ہے۔ صفدر کی بڑی لاڈلی ہے۔ آ کر کہے گا کہ اسے چھوڑ کر مزے سے بیٹھی رہی۔" وہ بڑبڑ کرتی کوٹھری سے باہر نکل گئی۔ اس نے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ ہندستانی کے چہرے پر کیسا اندھیرا

بیٹھا گیا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اس کے میاں نے تو کبھی اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی۔ مزاج کا ایسا شکی کہ بیوی کو کوٹھری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

بادل اب بھی جھوم رہے تھے۔ کوٹھیوں کے ساتھ والی سڑک پر کاریں بڑی دھوم دھام سے رواں تھیں۔ بڑی بوڑھیوں نے دوپہر کا سناٹا اور ٹھنڈی ہوا محسوس کرکے اب کھاٹوں پر لیٹ کر اونگھنا شروع کر دیا تھا اور کوارٹروں کے باہر بندھی ہوئی شادان پٹھانی کی بکری جیسے بادلوں کے اندھیرے سے ڈر کر بار بار چیخ اٹھتی۔ رضیہ کوارٹروں کوارٹروں جھانکتی اور باتیں کرتی واپس آ گئی۔

صفیہ کھیلتے کھیلتے تھک کر کوٹھری کے بند کواڑوں سے ٹکی بڑی میٹھی نیند سو رہی تھی۔ صفیہ کو مسہری پر لٹا کر وہ خود بھی پڑ رہی۔ ایک بار بڑے زور سے بادل گرجا اور پھر بوندا باندی ہونے لگی۔ باہر بچوں کا شور ایک دم بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ سو گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ صفدر آ کر کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

"تو نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں صفدر؟"

"تو تھک کر جو سوئی تھی۔" صفدر نے قمیض کی جیب سے مزدوری کے تین روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

رضیہ نے جلدی جلدی اینٹوں کے چولھے پر چائے بنائی اور ساسر میں انڈیل انڈیل کر اپنے ہاتھ سے صفدر کو پلانے لگی۔ اس وقت وہ ایسی سرشار نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے پوری بوتل پلا دی ہو۔

"دو آنے کی کونین تو لا دے۔" پیالی رکھتے ہوئے رضیہ نے فرمائش کی۔

"کیوں؟" صفدر نے گھبرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور نبض دیکھنے لگا۔

"چھوڑ بھی مجھے کیا ہوا ہے، بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ بیچاری ہندوستانی ہے نا اس کے لڑکے کو بخار چڑھا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ منگا دوں گی۔"

"رہنے بھی دے، تجھے کیا۔" صفدر کسمسایا اور صفیہ کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔ وہ اب تک

بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔

"ہوں، مت لا"، رضیہ منمنائی۔" وہ کہے گی کہ جھوٹی تھی۔ صفدر تو اس کی بات مانتا ہی نہیں۔ یونہی ڈینگ مارتی ہے۔"

"تجھے جھوٹا کہنے والی کی زبان نہ کھینچ لوں۔" صفدر نے روٹھی ہوئی رضیہ کے گال پر مہین سی چٹکی بھر لی اور پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی لاتا ہوں۔" وہ کوٹھری سے نکل گیا۔

بادلوں کی وجہ سے آج کتنی جلدی شام ہو گئی تھی۔ رضیہ نے لالٹین جلا کر طاق پر رکھ دی اور کھانا پکانے کا انتظام کرنے لگی۔ روز کی طرح آج بھی صفدر گوشت لایا تھا۔ رضیہ کو آج گوشت کی مہک سے نفرت سی ہونے لگی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی صفدر نے کبھی گوشت کا ناغہ نہ کرایا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ رضیہ گوشت بہت پسند کرتی ہے۔

گوشت پر چپکا ہوا کاغذ صاف کرتے ہوئے رضیہ کو یاد آیا کہ جب اس نے صفیہ کے باپ کو پہلے ہی دن بتایا تھا کہ اس کی بہنوں کے گھر ایک وقت گوشت پکتا ہے تو اس نے بھی گوشت کی بھرمار شروع کر دی تھی۔ گائے کے گوشت کے موٹے موٹے ریشے جب اس کی ساس کے دانتوں میں پھنس جاتے تو تیلی سے کرید کرید کر ہزاروں گالیاں دیتی تھی اور وہ جی ہی جی میں اس کے جلنے پر مزے لیا کرتی مگر پھر ایک دن ایسا بھی آ گیا تھا کہ وہ روزانہ سل پر پودینے کی چٹنی پیس پیس کر کھاتی اور آنسو بہاتی رہتی۔

گوشت دھوتے دھوتے رضیہ نے دہل کر ہر طرف دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ سب انسان ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔

میلا پانی کوٹھری کے باہر پھینک کر اس نے صفیہ کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ "دیکھ تیرا ابا آ گیا ہے۔ اب ہاتھ منہ دھو لے اور چولھے پاس آ کر بیٹھ جا۔" رضیہ اب کچھ نہیں یاد کرنا چاہتی تھی۔

صفدر کونین لے کر آیا تو رضیہ گوشت بھون رہی تھی۔ ہانڈی سے ایک بوٹی نکال صفدر کے منہ میں ڈال دی۔ "چکھ کیسے مزے کا ہے۔" وہ اٹھلائی اور پھر چولھے کی لکڑیاں آگے کھینچ کر ہندوستانی کے کوارٹر میں چلی گئی "لے بہنا، آدھی گولی کھلائیو۔ صبح تک بخار اتر جائیگا۔"

تیرا آدمی ابھی نہیں آیا؟"

"ابھی کہاں، گھومتا پھرتا آئے گا، بیٹھو نا۔"

"لے صفدر آیا بیٹھا ہے۔ وہ بھلا میرے بغیر چین لے گا" رضیہ ایک آنکھ میچ کر ہنسی اور بچے کا بخار دیکھ کر چلی گئی۔

پانچ چھ دن گزرے تو رضیہ کو احاطے کے سلسلے میں بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں یعنی کہ یہ احاطہ ایک بڑی نیک بی بی کا ہے۔ انھوں نے غریبوں کے رہنے کے لئے کچی اینٹوں سے کوارٹر بنوا دیئے ہیں۔ کرایہ صرف پندرہ روپے مہینے کے حساب سے لیتی ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے کرایہ دار کے سر۔ تیز بارش میں لوگ ساری ساری رات جاگ جھتوں کی لیپا پوتی کرتے ہیں۔ یہاں برسات کی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف لینے والوں کی یہی سزا مقرر تھی۔

یہ باتیں سنتے ہی رضیہ نے دو تین ٹوکریاں مٹی کھود کر اپنی مسہری کے نیچے جمع کر لی تھی۔ کیا پتہ کب چھت سے پرنالہ بہنے لگے۔

مہینے کے مہینے مکان دارنی اپنے دو عدد نوکروں کے ساتھ احاطے میں معائنے کے لئے آتیں، کرایہ وصول کرتیں اور مزید مرمت کا حکم دے کر چلی جاتیں۔ رضیہ کو انہیں دیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ بیلو نے بتایا تھا کہ وہ بالکل رضیہ جیسی خوبصورت ہیں۔

صبح صبح صفدر روٹی کھا کر اور رضیہ کو پیار کر کے چلا جاتا تو پھر اس پر ایکدم بوکھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ صفدر کے جاتے ہی وہ ہندوستانی کے کوارٹر میں چلی جاتی۔ شادی کو ڈھائی سال ہوا ہے مگر وہ ایک لمحے کو بھی صفدر کی جدائی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

ہندوستانی نے اسے احاطے کی بڑی بڑی ڈھکی چھپی باتیں بتائی تھیں۔ مثلاً کس کا کس سے عشق چلا تھا۔ کس کس کے شوہر نے داشتائیں رکھ چھوڑی ہیں اور کون کون اپنی بیویوں کی مرمت کرتا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے ہندوستانی نے اپنی روز کی مرمت کا حال صفا چھپا لیا تھا اور یہ سب راز کھول کر اس نے رضیہ کو قسم دی تھی کہ کبھی کسی کو بتائے گی نہیں۔ وہ تو اسے اپنی

سگی بہن کے برابر سمجھتی ہے اس لئے سب کچھ کہہ دیا۔

رضیہ نے اس کی ہر بات کو مان لیا تھا۔ اسے تو ہندستانی کی محبت پر پہلے ہی دن اعتبار آگیا تھا۔ رضیہ گھنٹوں اس سے صفدر کی باتیں کرتی اور وہ خوش ہو ہو کر سنتی رہتی۔ اسے ہزاروں دعائیں دیتی رہتی۔ اب کسی کو دلوں کا حال تو معلوم نہیں ہوتا۔ سب ظاہر پر نظر رکھتے ہیں۔ رضیہ کو شبہ تک نہ ہوتا کہ ہندوستانی اس سے نفرت کرتی ہے۔ یہ محبت تو کونین کی گولیوں سے شروع ہوئی تھی۔ اس محبت میں کڑواہٹ تھی، بے بسی تھی۔ اگر اسے رضیہ سے اپنے کام نہ لینے ہوتے تو وہ ڈائنوں کی طرح اس کا منہ نوچ لیتی اور اس کی زبان کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیتی۔ اس نے تو شادی کے اتنے برس گزارنے کے بعد بھی کبھی اپنے شوہر کی زبان سے محبت کا ایک لفظ تک نہ سنا تھا۔

تھوڑے دن اور گزرے تو رضیہ اور صفدر کی محبت احاطے میں مذاق بن گئی۔ عورتیں اسے چھیڑتیں تو وہ بڑی خوش ہوتی۔ ہمک ہمک کر کہتی "ہاں بھائی، ہے محبت، پھر؟" کنواری لڑکیاں بھی چھیڑنے میں پیچھے نہ رہتیں "ماسی تیرا صفدر نہیں آیا؟"

"تبھی تو ماری ماری پھر رہی ہوں۔ اس کے بغیر جی کب لگتا ہے۔" وہ تڑ سے جواب دیتی۔ اس چھیڑ چھاڑ میں رضیہ کے دن بڑے مزے کے گزر رہے تھے۔

وہ احاطے میں آکر بڑی خوش تھی۔ پہلے جہاں صفدر نے کوارٹر لیا تھا وہ تو سخت بیزار کر دینے والی جگہ تھی۔ ہر طرف کوٹھیاں، مصروف بیگمیں، فرصت کو ترستے ہوئے نوکر، رضیہ نے لاکھ دوڑ بھاگ کی۔ مگر کوئی دو منٹ کو بیٹھ کر اس سے باتیں نہ کرتا۔ کوئی نہ سنتا کہ رضیہ پر صفدر مرتا ہے اور وہ دنیا کی خوش نصیب عورت ہے۔ اسے یہ بیگمیں کیسی عجیب لگتیں۔ اسے ان پر بہت ترس آتا۔ بیچاری پیاسی بٹیریاں۔ صفدر نے اسے بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہاں بیویوں کو کوئی نہیں چاہتا۔

گرمیوں کی رات جب صفدر کا اجلا بستر کوٹھری کے باہر لگ جاتا اور وہ لیٹتے ہی ٹرانزسٹر چلا کر اپنے پہلو میں رکھ لیتا تو احاطے کے شوقین مزاج مرد عورتیں اس کی کھاٹ کے گرد جمع

ہو جاتے ۔ رضیہ بڑی محبت سے عورتوں کو اپنے بستر پر بٹھاتی اور مرد صفدر کی کھاٹ پر ٹک جاتے ۔ گانے ہوتے رہتے، مرد آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ حکومت کے معاملات۔ ہونے والے صدارتی انتخاب اور مہنگائی، سب پر اظہار رائے کیا جاتا اور آخر میں تان پیٹ کی دوزخوں کے بھرنے پر ٹوٹتی ۔ "ہمیں کیا، کوئی آئے، کوئی جائے، جو آٹا سستا کرے وہی اپنی حکومت کہلائے" صفدر بیزار ہو کر بات ختم کر دیتا اور مزے سے گانے سننے لگتا مگر شاداں پٹھانی کا میاں اکڑا رہتا۔ "نہیں، آٹا چاہے اور مہنگا ہو جائے۔ ام عورت کا حکومت نہیں مانے گا۔ یہ امارا بے عزتی ہے۔ عورت کو اللہ نے چھوٹا بنایا ہے"

پٹھان کو کوئی جواب نہ دیتا۔ سارا فرمائشی پروگرام اوپر ہی اوپر نکلا جاتا تو سب کھلکھلا اٹھتے۔ کبھی کبھی رات کو شاداں کا شوہر لکڑیوں کی ٹال پر سے اپنے دوستوں کو ساتھ لے آتا اور وہ رات گئے تک اپنی زبان میں لوک گیت گاتے رہتے۔ شاداں دوڑ دوڑ کر سب کو گانے سننے کی دعوت دیتی اور قہوہ بنا بنا کر پلاتی۔ رضیہ اس محفل میں کبھی شریک نہ ہوتی تھی۔ اس نے ہندوستانی سے کہا کہ بہنا میں کیوں جاؤں، کیا میرے گھر ریڈیو نہیں، ان کے گانے سے تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ ہندوستانی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اب بھلا وہ سچی بات کیسے کہتی کہ اسے تو وہ گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کوٹھری سے باہر کچھ بھی ہو اسے وہ سب کچھ دیکھنے کی حسرت رہتی ہے۔

مگر جب سے رضیہ کے ٹرانزسٹر نے سارے احاطے والوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا، شاداں پٹھانی بھی مارے جلن کے مہینے میں ایک بار گانے کی محفل ضرور منعقد کراتی۔ رضیہ کی باتیں سن سن کر اب وہ بھی یہ ثابت کرنے پر تل گئی تھی کہ اس کا میاں بھی کچھ کم چاہنے والا نہیں۔ اپنے شوہر کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے وہ رضیہ کا سب کے سامنے مذاق اڑاتی رہتی ——— "چاہے روز جوتی کھاتا ہو پر بات دوسری کرتا ہے" ان دنوں تو شاداں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر اس کا شوہر اسے مارتا پیٹتا تو وہ اندر سے کوٹھری کے دروازے بند کر لیتی۔ تا کہ باہر کوئی نہ سن سکے۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنے شوہر کے ہاتھوں روئی کی طرح دھنک جاتی مگر ہوں تک نہ کرتی۔

آج جب رضیہ ہندوستانی کی کوٹھری میں گئی تو اس نے بتایا کہ شاداں آئی تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی اور کہتی تھی کہ چاہے روز جوتیاں کھاتی ہو مگر میاں کی محبت کے ڈھنڈورے پیٹنے سے باز نہیں آتی۔

رضیہ اتنی بڑی بات سن کر قابو سے باہر ہو گئی ۔۔۔ "خود حرامزادی جوتیاں کھاتی ہو گی۔ اسی لئے کہتی ہے۔ میرے صفدر نے تو کبھی کپھل کی جھڑی بھی نہیں چھوائی۔ ابھی پوچھتی ہوں اس سے۔"

"لو جب سے تم آئی ہو اس کے مار کھانے کا پتہ نہیں چلا ورنہ ایسی ایسی ماریں کھاتی تھی کہ حد نہیں۔ اس کے ماتھے پر جو داغ ہے وہ بھی مار کا ہے۔ آٹھ دس دن پٹی باندھ کر پھری تھی۔"

"ایسا بتاؤں گی اس حرامزادی کو کہ یاد کرے گی۔" رضیہ ایکدم اٹھ پڑی۔

"للّٰلہ میرا نام مت لیجو رضیہ۔ میں نے تو محبت کے مارے تجھے بتا دیا ہے۔ تیرے خلاف بات سن کر کلیجہ جل گیا تھا۔" اس نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھالیا۔ "بہن تم صبر کر جاؤ۔ میں نے تو جانے یہاں کتنا جی مارا ہے۔ میں پردہ کیا کرتی ہوں کہ سب مذاق اڑاتی ہیں۔ میری زبان تک کی نقلیں کرتی ہیں۔ بھلا اپنی طرف کا ہے کو ایسا ہوتا تھا۔"

"بہنا میرے کوٹھے میں بھی ایسا نہیں ہوتا۔" رضیہ نے فخریہ کہا۔ اسے پتہ ہی نہ تھا کہ وہ ہے کہاں کی۔ تقسیم کے وقت وہ ننھی سی تھی۔ اس کے گھر میں کبھی اس قسم کے ذکر نہ ہوئے۔ بس سب کو بیٹوں کی پڑی رہتی۔ ملکوں کو کون روتا۔

ایک ذرا اٹک کر رضیہ پھر کھڑی ہو گئی۔ "میں اس سے پوچھوں تو بہنا، تیرا نام بھی لوں تو زبان کاٹ لیجیو۔"

"اری کس کس سے پوچھے گی رضیہ۔ ساری عورتیں دل ہی دل میں تجھ سے جلتی ہیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہتیں تو کیا ہوا اور۔۔۔۔۔۔" ہندوستانی چپ ہو گئی کیونکہ رضیہ پوری بات سنے بغیر ہی چلی گئی تھی۔

دوپہر ہو چکی تھی، ہوا بالکل بند تھی۔ عورتیں گھنے درختوں کے سائے تلے پڑی ہوئی کھاٹوں پر بیٹی پنکھا جھل جھل کر اونگھ رہی تھیں۔ بچے ہینڈ پمپ کے پاس کشتیاں لڑ رہے تھے اور ڈونگوں

کٹوروں سے پانی اچھال رہے تھے۔

"کہاں چلیں ماسی ؟" پیلو نے ٹوکا۔ وہ اپنی اماں کے پاس بیٹھی کروشیا سے لیس بن رہی تھی۔ رضیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مارے غصے کے کانپ رہی تھی۔ اس نے شاداں کی کوٹھری کے پاس جا کر ہی دم لیا۔ کوٹھری میں تالہ پڑا ہوا تھا اور باہر بندھی ہوئی بکری آنکھیں بند کئے جگالی کر رہی تھی۔ وہ کہاں ہے اپنے خصم کی لاڈلی۔ ذرا صورت تو دیکھوں اس کی۔ بہت بڑھ بڑھ کر بولنے لگی ہے۔" رضیہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔

"کیا بات ہے ؟" احاطے کی بوڑھی بیوہ درزن نے اونگھتے سے چونک کر پوچھا۔

"بس یہ بتادے ماسی کہ وہ شہزادی ہے کہاں ؟"

"ادھر ہے پرلی طرف، اس بڑے درکھت کے پاس۔" پیلو نے مزے میں آکر بتایا۔ وہ رضیہ کے ساتھ ہو لی تو دوسری عورتیں بھی جلدی جلدی اپنی کھاٹوں سے اٹھنے لگیں۔

"ہاں تو اب بتا بہنا، میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے، جو میرے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔ کوٹھری کے اندر تیرا خصم روز تجھے جوتیاں لگاتا ہے۔ میرے صفدر نے تو مجھے کبھی انگلی بھی نہیں چھوائی۔"

پٹھانی اپنے بچے کو سینے سے لگائے اونگھ رہی تھی۔ اس اچانک حملے سے ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ سرہانے رکھا ہوا دوپٹہ اٹھا کر سر پر ڈال لیا۔ اس کا منہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ "پہلے یہ بتا کون کہتا ہے ؟"

"کوئی کہتا ہے۔ تو بتا لاڈو تو نے مجھے کب جوتیاں کھاتے دیکھا ہے ؟ تجھے تو سب نے دیکھا ہے۔"

"نئیں بتاتا تو پھر ام نے کہا ہے، تیرا آدمی آسمان سے اترا ہے جو نئیں مارتا۔ تم جوٹ بولتا ہے۔"

"جھوٹ بولتی ہوگی تو۔ جوتیاں کھاتی ہوگی تو۔" رضیہ پٹھانی کے بالوں میں جھول گئی۔

"پہلے تو عورتوں نے دونوں کو الگ کرنا چاہا مگر جب وہ نہ مانیں تو کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگیں۔

شروع میں تو دونوں برابر رہیں۔ مگر پٹھانی آخر پٹھانی تھی۔ اس نے مار مار کر رضیہ کا خوبصورت چہرہ سجا دیا۔ دانتوں سے خون نکال دیا اور پھر رضیہ خود بخود الگ ہو کر زور زور سے رونے اور چیخنے لگی۔ "دیکھ لو بہنا، میرا منہ سجا دیا ہے۔ سب گواہ رہیو۔ میرے منہ سے خون بہا ہے۔ شام آنے دے صفدر کو۔ وہ گت بنواؤں گی کہ لوگ بھی دیکھیں گے۔ اری وہ تو میرے حکم پر ناچتا ہے اور یہ حرامزادی کہتی ہے کہ مارتا ہے۔"

"ارام زادی تم ہوگا، تمارا ماں ہوگا۔" شاداں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا اور رضیہ کی طرف جھپٹی مگر بیلو نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور زبردستی اس کی کھاٹ پر بٹھا دیا۔ پھر وہ رضیہ کو کھینچتی ہوئی اس کی کوٹھری میں لے گئی۔

اب شاداں نے بلک بلک کر رونا شروع کیا تو عورتیں اسے چپ کرانے لگیں۔ مگر وہ کسی طرح چپ نہ ہو رہی تھی۔ شاید اسے خیال آ رہا ہوگا کہ آج رات اسے پھر کوٹھری کے دروازے بند کر کے مار کھانی ہوگی۔ جب وہ کسی سے لڑتی تو اس کا شوہر اسے ضرور سزا دیتا۔ یہاں تو لوگ ذرا سی بات پر سر پھڑوا کر تھانے جانے کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ صرف ایک بار پٹھان نے شان میں آکر فساد بڑھایا تھا تو اس کی ساری جمع جتھا تھانے کے چکروں کی نذر ہو گئی تھی۔ آج تک وہ اپنی حالت سنبھال نہ سکا تھا۔

کوٹھری میں جا کر رضیہ مسہری پر پڑ گئی اور رو رو کر برا حال کرتی رہی۔ صفیہ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر جلدی سے باہر بھاگ گئی۔ بیلو رضیہ کو تھامے اس کے پاس بیٹھی اسے سمجھا رہی تھی۔ اس کا تو یہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہ چاہ رہا تھا۔ وہ تو یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ صفدر آ کر کیا کرتا ہے۔

"ماسی لالٹین صاف کر کے رکھ دوں؟ شام پڑنے والی ہے۔" بیلو نے پوچھا۔

"کر دے۔" رضیہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو اس وقت تک کچھ نہ کروں گی جب تک صفدر نہ آ جائے۔" صفدر کے لئے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ اب اسے صفدر ہی تو اس دکھ سے نجات دلا سکتا تھا۔ صفدر ہی نے تو اسے نفرتوں کے جہنم سے نکال کر محبت کی

ٹھنڈی چھاؤں تلے بٹھایا تھا۔

پیلو نے لالٹین صاف کر کے کھونٹی پر لٹکا دی ۔ " اب بس بھی کر ماسی، مت رو " پیلو نے اس کی پیٹھ سہلائی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ رضیہ کی سسکیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

پانچ بجے کے قریب صفدر آگیا۔ پیلو کو دیکھ کر اس نے نظریں نیچے جھکالیں اور سودے کی پوٹلی میز پر رکھ دی۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا کہ رضیہ کی سسکی سن کر ایکدم بوکھلا گیا۔ " کیا ہوا ہے ری ؟" وہ تقریباً چیخ پڑا اور رضیہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ " کچھ بول بھی نا ؟"

پیلو اٹھ کر کوٹھڑی کی دہلیز پر بیٹھ گئی۔

" وہ شاداں نے مارا ہے " رضیہ نے سوجا ہوا چہرہ صفدر کے سامنے کر دیا ۔ " کہتی تھی کہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتا، تو مجھے روز جوتیاں مارتا ہے ۔ وہ تجھے بدنام کرتی تھی ۔ جب میں نے پوچھا تو میری یہ حالت بنائی "

" کون ہوتی ہے وہ مارنے والی " صفدر اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

" سب جلتے ہیں تیری محبت سے، سب " رضیہ تڑپ کر روئی۔

" میں مارنے والوں کے ہاتھ نہ کاٹ لوں گا " وہ دروازے کی طرف لپکا اور رضیہ کے پکڑنے کے باوجود باہر چلا گیا۔ رضیہ نے حیران پیلو کی طرف دیکھا اور پھر آنسو پونچھنے لگی ۔ " دیکھ میں نہ کہتی تھی کہ صفدر سن پائے تو جانے کیا کر بیٹھے " کوٹھری کھلی ہی چھوڑ کر وہ صفدر کے پیچھے لپکی۔

" میں جان کو نہیں ڈرتا، پھانسی چڑھ جاؤں گا مگر مارنے والوں کے ہاتھ ضرور کاٹ کے رہوں گا " صفدر شاداں کی کوٹھری کے پاس جا کے دہاڑا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ کر لڑنے دعوت دینے لگا۔ احاطے کے سارے مرد عورتیں اس کے پاس جمع ہو گئے۔

" اپنا عورت کو روکو، تمارا عورت لڑنے کو آیا تھا، جان کو ام بھی نئیں ڈرتا "

" پھر ٹھیک ہے تو آج فیصلہ کر لیں " صفدر نے شلوار کے پائنچے اوپر اڑس لیے اور پھر

جھپٹ کر پٹھان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

پٹھان کی بھبکی رائیگاں گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر سب کی طرف دیکھا۔ "دیکھو بائی، یہ عورت ذات روز روز لڑتا ہے مگر ام تم ایک دین کا جاننے والا ہے پھر کس واسطے لڑے۔ ام اپنی بیوی کو سزا دے گا اور جو ام نے لڑ کر خون کیا تو خدا کا بھی گناہ گار ہوگا۔ دنیا والا بھی کہے گا کہ بائی نے بائی کا خون کیا۔" پٹھان نے بڑی آہستگی سے صفدر کا ہاتھ ہٹایا اور پھر ہنسنے لگا۔ "چل چھوڑ صفدر، بھائی جو کہتا ہے، مگر تو اپنی بیوی کو منع کر لے، یوں ہی باتیں نہ بنایا کرے، ہاں۔" رضیہ کا دل پگھل گیا۔

صفدر سر جھکائے اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

"دیکھو ماسی، میں سچ کہتی تھی نا کہ صفدر اتنی محبت کرتا ہے۔ ابھی جانے کیا کر بیٹھتا۔" رضیہ نے درزن سے کہا اور اس طرح سب کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو اب اور جلو پھر وہ بڑے غرور سے قدم اٹھاتی اپنی کوٹھری کی طرف چل دی۔

جب صفدر ہلدی پیس کر رضیہ کے منہ پر تھوپ رہا تھا تو اس وقت پٹھان شاداں کو اس طرح پیٹ رہا تھا کہ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں اور بند کوٹھری کے باہر کھڑی ہوئی عورتوں کے دل دہلے جا رہے تھے۔

اس وقت پیلو نے سب کو نقلیں کر کر کے بتایا کہ کس طرح صفدر نے رضیہ کو اٹھایا اور پھر اپنی چھوٹی بہن کو سینے سے لگا کر بتایا کہ یوں سینے سے لگایا۔ ایسا بے شرم جس کی کوئی حد نہیں۔ احاطے کی ساری عورتوں کی ہمدردیاں شاداں کے ساتھ تھیں۔ رضیہ کی تو صورت سے نفرت ہو گئی تھی سب کو۔ رضیہ کی طرف سے سب کے کلیجے پھٹے گئے تھے۔

دوسرے دن رضیہ کے چہرے کی سوجن اتر گئی اور وہ جیسے سب کچھ بھول بھال کر اور بھی خوش پھر رہی تھی۔ "اری بہنا ساری رات جاگ کر صفدر منہ دیکھتا رہا۔" اسنے ہر ایک کو بتایا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ حالانکہ ان کے تیور یہی کہہ رہے تھے کہ ایک بار سب باری باری اس کا منہ سجانے کی خواہش میں مر رہی ہیں۔ مگر صفدر تو جان سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس لئے کوئی رضیہ

کے کیا منہ لگتا۔ ہاں جب وہ چلی جاتی تو پھر سب اس کا مذاق اڑاتیں، گالیاں دیتیں۔ وہ شاداں کو یقین دلاتیں کہ رضیہ تو عورت ہے ہی نہیں۔ کوئی رنڈی ہے۔ ورنہ عورت تو وہی ہوتی ہے جو مرد کی غلامی کرتی ہے اور جوتیاں کھاتی ہے۔ ایسی باتیں سن کر شاداں کا کلیجہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ وہ ہمک کر ہاں میں ہاں ملاتی "عورت کو خدا نے چوٹا بنایا ہے"۔ جس دن رضیہ سے لڑائی ہوئی تھی شاداں نے جیسے ہمیشہ کے لئے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ جدھر سے رضیہ گزرتی وہ دوپٹے کے پلو سے آڑ کر لیتی۔

ادھر پیلو دوستی کے پردے میں رضیہ کی تاک میں رہی۔ صفدر آیا نہیں کہ اس کے کوٹھری کے چکر لگانے شروع کئے "بھائی صفدر ریڈیو لگا" دو چار گانے سن کر بھاگ آتی اور پھر سب کو نقلیں کر کر کے بتاتی کہ رضیہ کس طرح اترا اترا کر باتیں کر رہی تھی اور کس طرح مٹک کر چل رہی تھی۔

اب رات جب صفدر ریڈیو بجاتا تو عورتیں رضیہ کے بلانے کے باوجود نہ آتیں۔ کام کا بہانہ کرکے بیٹھی رہتیں۔ رضیہ کو ان کے اس طرح جلنے پر بڑا مزہ آتا۔ مرد کتنے اور صفدر کی کھاٹ پر ٹک کر ریڈیو بھی سنتے اور باتیں بھی کرتے۔

بس ایک ہندوستانی تھی جس سے رضیہ کی دوستی تھی۔ وہ رضیہ کو دیکھتے ہی سارے کام چھوڑ کر باتیں کرنے بیٹھ جاتی۔ اب تو رضیہ اپنے پیسوں سے اس کے لئے سستا سا تیل، جوئیں نکالنے والی کنگھی اور بال ہنیں بھی لے آئی تھی اور جب اس نے پیسے دینے کی کوشش کی تو رضیہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ "اری بہنا صفدر تو کہتا ہے کہ سب کچھ تیرا ہے، چاہے دونوں ہاتھوں سے لٹا دے۔ پھر میرا پیسہ تیرا پیسہ نہیں ہوا"۔

اب برسات گزر چکی تھی اور اچھی خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ دن اتنے چھوٹے ہونے لگے تھے کہ چار بجے سے پرندے درختوں میں بسیرا لینے کے لئے شور مچانے لگتے۔ کوٹھریوں میں چراغ جل جاتے اور سرِ شام ہی احاطہ سونا سونا ہو جاتا۔ اس سناٹے میں کسی کسی وقت ہینڈ پمپ کی ہنہنی شور مچاتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ صبح جب دھوپ چڑھتی تو مرد مزدوری پر چلے جاتے۔ عورتیں

دھوپ میں آ بیٹھتیں اور جب جسم خوب گرم ہو جاتے تو پھر کام کاج میں جٹ پڑتیں۔ صفدر کے جانے کے بعد رضیہ بھی دھوپ کی تلاش میں سب کے پاس آجاتی اور گرم چادر میں چھپے ہوئے مالٹوں کی پھانکیں چوسنا شروع کر دیتی — "اب چوتھا مہینہ چڑھا ہے —" وہ معنی خیز ہنسی ہنستی۔ "اے بہنا مجھے جب تک کھٹی چیز نہ ملے منہ پھیکا پھیکا رہتا ہے۔ اسی لئے تو صفدر یہ ڈھیر سے مالٹے روز اٹھا لاتا ہے۔" وہ سب کو ضد کر کر کے ایک ایک پھانک پکڑا دیتی ہے۔

"تو روز حساب بتاتی ہے ماسی۔ اس خوشی میں سب کو ایک ایک مالٹا کھلا۔ یہ ایک ایک پھانک کھلاتی ہے۔" آخر ایک دن پیلو نے فرمائش کر دی اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو آنکھ مار کر ہنس دی۔

"کھلا دوں گی ری۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ کل ہی لے۔ اللہ قسم صفدر تو مجھ پر روپیہ پیسہ سب قربان کرتا ہے۔"

دوسرے دن رضیہ نے سچ مچ پیلو کی فرمائش پوری کر دی۔ اس نے ساری عورتوں کی خوشامدیں کر کر کے دو دو پیسے والا مالٹا کھلا کر ہی دم لیا۔

رضیہ کے جانے کے بعد شاداں بکھرے ہوئے چھلکوں کو دیکھ کر بڑی دیر تک گھنی گھنی گالیاں بکتی رہی اور مالٹے کھانے والیوں نے اپنی صفائی کر دی۔ "جب کوئی آتنی ضد کرے تو کھانا ہی پڑتا ہے۔" پھر وہ سب بھی گالیوں میں شاداں کا ساتھ دینے لگیں۔ بھلا ان میں سے کس کی مجال تھی جو کسی کو مفت میں دو آنے بھی دے دیں۔ مستری کی بیوی بشیراں کی پہلی طلاق صرف اس لئے ہوئی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کی کمائی سے دو روپے نکال کر چپکے سے مانگنے والوں کو دے دیئے تھے۔

رات سردیوں کی پہلی بارش ہوئی تھی مگر صبح ہوتے بادل کھل گئے۔ ایسے زور کی سردی ہوئی کہ سب کے دانت بج اٹھے۔ اس پر غضب یہ کہ رضیہ کے کوٹھے سے سردی کی لہر آگئی تھی۔ آج تو صفدر بھی سردی کے ڈر سے اب تک کام پر نہ گیا تھا۔ چائے کی کئی پیالیاں پی چکا تھا۔

"چل ماسی باہر دھوپ چڑھ گئی۔" صفدر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ پیلو آگئی۔

"لے، میں ابھی جا سکتی ہوں ہ، ذرا بیٹھ پھر چلوں گی۔"

"چلے گی تو کیا ہوگا۔ صفدر بھائی کوٹھری بند کر کے چابی تجھے دے جائے گا۔" بیلو دہلیز پہ کھڑے کھڑے اٹھلائی۔

"تو جانا، میں آجاؤں گی۔" رضیہ بیلو کو آنکھ مار کر ہنسی۔

"بہت سردی ہے اندر، تو چلی جانا۔" صفدر نے پیار سے کہا۔

"واہ تجھے چھوڑ کر چلی جاؤں۔"

"اچھا تو لے میں اب چلا۔" وہ تھیلا اٹھا کر جلدی سے چلا تو بیلو اس سے بچتے بچتے ٹکرا ہی گئی اور پھر دوپٹے کا پلو منہ میں ٹھونس کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

رضیہ جب دھوپ میں پہنچی تو بیلو پہلے ہی سب کو بتا چکی تھی کہ آج رضیہ اور صفدر کس طرح باتیں کر رہے تھے اور کیسے چونچلے ہو رہے تھے۔ سب تو خیر دو چار باتیں ہی بنا کر چپ ہو رہے مگر شاداں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جو اس نے سب کی نظر بچا کر خشک کر لئے تھے اور اس نے جیسے ہی رضیہ کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا تو پیٹھ موڑ کر بچے کو دودھ پلانے لگی تھی۔

"اری بہنا جی بڑا خراب رہنے لگا ہے۔ صفیہ کی دفعہ تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اب تو یہ حال ہے کہ کسی طرح چین نہیں پڑتا۔ صفدر ساری رات اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہے۔ ذرا ہوں بھی کروں تو دبانے بیٹھ جاتا ہے، اور ـــــ"، رضیہ مالٹا چھیلتے ہوئے سب کو بتا رہی تھی۔ مگر کوئی بھی اسے جواب نہ دے رہا تھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بھلا کہاں تک کوئی اس کی یہ باتیں سنتا رہتا۔ اب تو ان سب کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس کا منہ نوچ کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہیں۔ ان محبت سے خالی زندگیوں میں رضیہ نے کیسی ہلچل مچا دی تھی۔

رضیہ دیر تک بیٹھی رہی، بولتی رہی اور پھر رنجیدہ سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سردی کی بھی پرواہ نہ کی اور ہندوستانی کی کوٹھری میں جا بیٹھی۔ سب اس سے جلتے ہیں۔ آج یہ خیال رضیہ کے لئے بڑا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ اس طرح تو سب اس سے چھٹ جائیں گے۔ پھر وہ کس سے بولے گی۔ کس سے صفدر کی باتیں کرے گی۔

ہندوستانی برتن رکھ کر اس کے پاس آگئی۔" یہاں تو بڑی سردی ہے بہن۔"

" باہر بیٹھ کر کیا کروں، کوئی بولتا ہی نہیں، سب مجھ سے جلتے ہیں۔ مجھ سے کیوں جلتے ہیں بہنا؟" رضیہ ایکدم رو پڑی۔

" رو نہیں تمہارے دشمن۔" ہندوستانی اس کے آنسو پونچھنے لگی ___ " وہ جلیں نہ تو پھر کیا کریں، ان کے گھروں میں تو روز جوتیوں میں دال بٹتی ہے، تم ان کی پرواہ کیوں کرتی ہو۔" اس نے سمجھایا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ اس وقت اسے روتی ہوئی رضیہ سے واقعی ہمدردی ہو رہی تھی۔

" پر بہنا میں نے تو ان سے نہیں کہا کہ جوتیوں میں دال بانٹو، میرا کیا قصور ہے۔" رضیہ نے کہا تو ہندوستانی چپ ہو گئی۔ شاید اسے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا۔ وہ خود بھی تو رضیہ سے جلتی رہی تھی۔

" اب میں چلی بہنا کام پڑا ہے۔" رضیہ کا جی نہ لگا تو اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور دیر تک لیٹی رہی۔ آج اسے پھر اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔

آج پھر سرِ شام بادل گھر کر آگئے تھے۔ ایسے زور کی گرج چمک ہو رہی تھی کہ دل دہلے جاتے۔ رضیہ نے چولہے میں ڈھیر سی لکڑیاں جلا دی تھیں جو رات گزرنے کے ساتھ بجھی جا رہی تھیں۔ صفدر اس کے قریب ہی مسہری پر پڑا سو رہا تھا۔ صفیہ اس کے پہلو میں لیٹی تھی۔

جب ذرا گرج کم ہوئی تو رضیہ کو بھی نیند آگئی مگر ان دنوں تو اسے گہری نیند آتی ہی نہ تھی۔ اب وہ پورے دنوں سے تھی۔ ساری رات جسم ٹوٹتا رہتا۔ کسی کروٹ چین نہ پڑتا۔

وہ ذرا دیر سوئی تھی کہ آنکھ کھل گئی اور پھر اس نے گھبرا کر دیکھا کہ صفدر اپنے بستر پر نہیں ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی مگر دوسرے ہی لمحے صفدر آگیا۔

" ارے اس سردی میں کہاں گیا تھا تو؟"

" سو بھی جانا، ساری رات پہرہ دیتی رہتی ہے۔" وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔" پیشاب کو گیا

تھا،" اس نے نرمی سے بتایا اور اپنے بستر پر لیٹ کر لحاف میں منہ چھپا لیا۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں رضیہ نے ایک لمحے کو حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سوچا کہ نیند میں ہے، سارے دن کا تھکا ماندہ۔ کیا ہو گیا جو زور سے بول پڑا۔

صبح بادل کھلے ہوئے تھے۔ صفدر بڑے سکون سے بیٹھا صفیہ کے ساتھ چائے پی رہا تھا اور رضیہ بھونرے کی طرح اس کے گرد گھوم رہی تھی — "صفدر آج تو میرا جی بہت خراب ہو رہا ہے۔"

"کام نہ کیجیو، آرام سے لیٹی رہیو۔"

"صفدر تو رات اتنی زور سے بولا کہ میں ڈر گئی۔ کیا تو مجھے ڈانٹ بھی سکتا ہے؟"

"میں تو تیری وجہ سے کہہ رہا تھا کہ رات بھر آرام سے سویا کر۔" صفدر کی نظریں جھک گئیں اور وہ تھیلے میں اپنا سامان ڈالنے لگا۔

"وہ تو میں جانتی ہوں، بھلا ویسے تو ڈانٹ سکتا تھا!" وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگی۔

صفدر کے جانے کے بعد اس نے بستر ٹھیک کئے، برتن سمیٹے اور چینی کی پیالیاں دھو کر دیوار گیری پر رکھنے لگی تو توجہ دھک سے ہو گیا۔ ٹرانزسٹر وہاں نہیں رکھا تھا۔ اس پر ڈالنے والا ریشمی کپڑا ایک طرف پڑا تھا۔ اس نے کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا مگر ہوتا تو ملتا۔ رضیہ کو برے برے خیال آرہے تھے۔ کہیں کوئی چرا کر تو نہیں لے گیا۔ اسے بار بار پیلو پر شبہ ہو رہا تھا۔ جب دیکھو کوٹھری میں گھسی چلی آرہی ہے۔ اس نے سوچا کہ خود نہ پوچھے۔ صفدر آ کر آپ ہی پوچھ لے گا۔ کیا پتہ وہی لے گیا ہو ٹھیک کرانے کو۔ کل اس سے گھر گھر کی آواز بھی تو آرہی تھی۔

کوٹھری بند کر کے وہ باہر دھوپ میں آگئی — "بہنا اب تو اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل لگتا ہے۔ صفدر ڈانٹ رہا تھا کہ آرام نہیں کرتی۔ مجھ سے تو نہیں لیٹا جاتا۔"

کسی نے اسے جواب نہ دیا مگر پیلو اس کے قریب سرک آئی — "تو پھر کیوں اٹھ آئی، لیٹی رہنا، صفدر کے بغیر تیرا جی بھی تو نہیں لگتا۔" وہ ہنسی۔

"جانے ٹرانزسٹر کہاں گیا میرا۔ پتہ نہیں صفدر لے گیا ہو گا بنوانے کو۔ کہتا تھا کہ آواز خراب ہو رہی ہے۔"

"چل پھر ٹھیک ہو کر آجائے گا"۔ ببلو اکیلے ہی گٹے کھیلنے لگی۔ "کھیلے گی ماسی ؟"

"نہیں مجھ سے جھکا نہیں جاتا"۔ وہ بیٹھے بیٹھے آپس میں باتیں کرتی ہوئی عورتوں کا منہ تکنے لگی اور پھر اٹھ کر اپنی کوٹھری میں آگئی۔

دن رینگ رینگ کر گزرا۔ آج تو اس سے کام بھی نہ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج تو صفدر خود ہی کھانا پکالے گا۔

شام جیسے ہی صفدر آیا تو وہ کراہتے ہوئے اٹھ گئی۔ "ارے تو میرا ٹرانزسٹر لے گیا تھا بنوانے؟"

"ہاں میں لے گیا تھا"۔ تھیلا میز پر رکھ کر وہ کرسی پر ہی ٹک گیا۔

"پھر لایا کیوں نہیں؟ میں تو سارا دن فکر کر کر کے مر گئی کہ کہیں چوری تو نہیں ہو گیا"۔

"میں نے تو اسے بیچ دیا، تجھے روپوں کی ضرورت پڑے گی نا"۔

"لے بھلا کیوں بیچ دیا؟ میں نے جو روپے اکٹھا کر رکھے ہیں"۔ وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔

"اِن روپوں سے تو اپنے بیٹے کا مونڈن کرائے گی، بکرے منگائے گی، سارے احاطے والوں کی دعوت کرے گی اور باجے بھی بجوا لیجیو"۔ وہ ہنسنے لگا۔ رضیہ کے گال خوشی سے تمتما اٹھے۔

"پھر سارے لوگ دیکھیں گے کہ تو نے کیسی شان سے "حقیقہ" کرایا ہے"۔

"ہوں"۔ وہ جوتے اتار کر مسہری پر لیٹ گیا۔

"اب کی بڑا سا ریڈیو خریدیں گے صفدر"۔ وہ چائے بنانے لگی۔

"ہاں"

"کیا تیری طبیعت خراب ہے؟"

"تھک گیا ہوں"۔ اس نے آنکھیں موندے موندے کہا۔

چائے دے کر رضیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ صفدر نے جلدی جلدی چائے پی اور پھر لیٹ گیا۔ مگر رضیہ اس کا ہاتھ تھامے بولے جا رہی تھی۔ "آج تو تو نے مجھے پوچھا بھی نہیں۔ سچ بڑا خراب دن گزرا ہے۔ پھر تو چلا جاتا ہے تو میری طبیعت اور بھی بگڑنے لگتی ہے۔ اب تو دو چار دن کی چھٹی کر لے، میرا دل گھبرا گیا ہے۔ وہ عورتیں بھی تو اب بات نہیں کرتیں، سب جلتی ہیں تیری محبت سے اور"

"رضیہ چپ ہو گئی۔ صفدر تو بے خبر سو رہا تھا۔ رضیہ نے اسے ٹھیک سے لحاف اوڑھایا اور پھر صفیہ کو بلانے چلی گئی۔ وہ اب تک باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

صفدر کو اتنا بے خبر سوتے دیکھ کر رضیہ کھانا پکانے بیٹھ گئی اور جب کھانا تیار ہو گیا تو اس نے صفدر کو جگانا چاہا مگر وہ کسی طرح بھی نہ اٹھا۔ بس ہوں ہوں کر کے پھر سو جاتا۔ رضیہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور بیمار ہے۔ صرف اسی کے خیال سے کچھ نہیں کہہ رہا۔ مارے فکر کے اس کا برا حال ہوا جا رہا تھا۔ صفیہ کو کھلا پلا کر وہ بھی بھوکی ہی پڑ گئی۔ رات بڑی دیر تک اسے نیند نہ آئی کیونکہ صفدر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلے جا رہا تھا۔ رضیہ ہوں ہوں کر کے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ خواب میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے دروازے پر دو دو بکرے بندھے ہیں اور وہ صفدر جیسی صورت کے بیٹے کو گود میں لئے مسہری پر بیٹھی ہے۔ ایک بار بکرے بڑے زور زور ممیائے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازے ہوا کی وجہ سے آپس میں ٹکرا رہے تھے اور باہر اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صفدر اپنے بستر پر نہ تھا۔ رضیہ اٹھ بیٹھی۔ پھر پیشاب کو باہر چلا گیا۔ کہیں سردی لگ گئی تو کیا ہو گا۔ اندر ہی کر لیتا میں صبح صاف کر لیتی ۔" وہ باہر اندھیرے میں گھورے جا رہی تھی۔

بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی مگر صفدر نہ آیا تو رضیہ کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ رات کو یوں باہر نکل گیا، جو کہیں کچھ ہو جائے تو پھر، چور چکار پھرتے ہوتے ہیں۔

صفدر کی تلاش میں باہر جانے ہی والی تھی کہ وہ آ گیا۔ دروازے بند کر کے سیدھا اپنے بستر پر چلا گیا۔ "پیٹ میں درد تھا۔ تو کیوں اٹھ گئی؟" اس نے دھیرے سے کہا۔

"رات تو نے کھانا بھی تو نہیں کھایا۔ صبح ڈاکٹر کو دکھانے ضرور جائیو۔ میں تیرا پیٹ سینک دوں؟" وہ اٹھنے لگی۔

"نہیں نہیں تیری طبیعت خراب ہے سو جا۔" اس نے لحاف میں منہ لپیٹ لیا۔

رضیہ بھلا کیا سوتی۔ باقی رات یوں ہی بیٹھ کر گزر گئی۔ مگر جب صبح وہ اٹھا تو بڑا بشاش

نظر آرہا تھا۔ اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر جاتے جاتے رضیہ کے گال میں چٹکی لیتا گیا۔ وہ اسے اچھا بھلا دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔" ہے دو دن طبیعت کیسی خراب رہی" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے جلدی جلدی سب کام بٹورا اور پھر کوٹھری کو تالہ لگا کر دھوپ میں سب کے پاس جا بیٹھی۔ ٹرانزسٹر بیچنے اور دھوم دھام سے عقیقہ کرنے کی جیسی بڑی خبریں سنانے کو وہ بےچین ہو رہی تھی ـــ" اری بہنا وہ بالکلا تو میرا ٹرانزسٹر بیچ آیا۔ کہتا تھا کہ ان روپوں سے تو اپنے بیٹے کا "حقیقہ" کرائیو۔ سارے لوگوں کی دعوت کیجیو، ریڈیو تو پھر آجائے گا، اور کہتا تھا کہ باجے بھی بجوا لیجیو" رضیہ کھکھلا کر ہنسی۔ اس نے شاداں کی طرف دیکھا جو اسکی طرف سے بیٹھ کے بیٹھی تھی۔ کسی پہ تو اتنی بڑی خبر کا اثر نہ ہوا۔

"ہے ماسی بیچ ڈالا" پیلو نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ اس خبر سے صرف وہی چونکی تھی۔

"ہاں ری، پھر کیا ہوا، دوسرا آجائے گا، اللہ صفدر کو زندگی دے"

"واہ ماسی تیرا ریڈوا ابھی ہوتا تو مزہ آجاتا۔ کل رات میرا ابا بھی ریڈوا لایا ہے۔ بالکل تیرے جیسا۔ بغیر بجلی کے چلتا ہے۔ دونوں مل کر بجاتے، خیر اب تو میرا ریڈوا سن لیا کیجیو"

"لا مجھے بھی دکھا" رضیہ نے شوق سے کہا۔

پیلو دوڑتی ہوئی گئی اور اپنی کوٹھری سے ٹرانزسٹر اٹھا لائی۔ رضیہ نے اسے دیکھا اور پھر جیسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے خود ہی تو اپنے ٹرانزسٹر کو ایک کونے سے کھرچا تھا تاکہ پہچان رہے، کوئی چرا نہ سکے۔

"رضیہ یہ تو بالکل تیرا جیسا ریڈیو ہے" بشیراں نے غور سے رضیہ کی طرف دیکھا۔ وہ ریڈیو گود میں رکھے ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں تلے دھیرے دھیرے اندھیرا چھا رہا تھا۔ سامنے کوٹھریوں کی قطار غائب ہو گئی اور پھر اتنا اونچا گھنا درخت بھی اندھیرے میں ڈوب گیا ـــ "چھوڑ صفدر" حقیقہ کون کرے۔ بکرے تو مر گئے۔ اب دعوت میں کسے بلانا ہے ـــ"

وہ زیر لب اس طرح بول رہی تھی کہ صرف ہونٹ ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔

"رات ابا آ کر چلائے گا، پھر تجھے بھی سنا دوں گی ماسی"۔ پیلو نے جیسے اس کی گود سے ٹرنزسٹر اچک لیا اور پھر سینے سے لگائے لگائے اپنی کوٹھری کی طرف بھاگ گئی۔ ساری عورتیں بڑی عجیب عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پیلو کے جاتے ہی وہ سب مارے ہمدردی کے رضیہ کی طرف سرک گئیں اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں۔

"صفدر اب تجھ سے کچھ نہیں کہنا۔ اب کوئی تیرے آنے والے بیٹے کو بھی جن باپ کا تھوڑی کرنا ہے ــــ" رضیہ کے ہونٹ برابر ہلے جا رہے تھے۔

"ہے بیچاری کیسی خوش پھرتی تھی۔ قسم لے لو جو میں اس سے جلتی ہوں"۔ اللہ رکھی نے کہا۔

"بس بھی تو یہی کہتی تھی کہ کہیں مرد ایسے ہوتے ہیں، ہے بیچاری!" بشیراں نے پلو سے آنسو پونچھ لئے۔

"اری تو یوں کیوں بیٹھی ہے کچھ بول نا، ہوش میں بھی آ" درزن نے رضیہ کو زور سے ہلایا تو وہ چونک پڑی اور اجنبی سی نظروں سے سب کی طرف دیکھنے لگی۔ اللہ رکھی، بشیراں اور درزن، سب کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ رضیہ دھیرے سے شاداں پٹھانی کی طرف سرک گئی ــــ" اری بہنا، اب تو کیوں مجھ سے ناراض ہے؟ اب تو من جانا۔ سارا جھگڑا ختم ہو گیا اب تو"۔ رضیہ شاداں کے گلے سے لپٹ کر اس زور سے روئی کہ شاداں بھی سسکیاں بھرنے لگی۔



مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم

جرائم کی چند حیرت ناک داستانیں

۱۶ر فروری ۱۹۲۰ء کو مددگار معتمدی سے ہم کو اسپیشل مجسٹریٹی اضلاع پر ترقی ملی اور اس تاریخ کو ہم نے اس اہم خدمت کا جائزہ حاصل کر لیا۔ اس سے پہلے کہ میں وہاں کے کچھ واقعات بیان کروں، یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اسپیشل مجسٹریٹی کیا چیز ہے۔ پہلے زمانے میں تمام ہندوستان میں ٹھگی و ڈکیتی کا ایک محکمہ قائم تھا اور اس کے لئے ایک خاص مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ بعد میں ٹھگی اور ڈکیتی کا محکمہ ٹوٹ گیا۔ اس لئے اس ریاستِ ابد مدت میں اس کے بجائے خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم ہوا۔ اور ٹھگی اور ڈکیتی کے جو عہدہ دار تھے ان کو خفیہ پولیس کے عہدہ دار قرار دیا گیا اور اسپیشل مجسٹریٹی کا عہدہ بحال خود قائم ہوا۔ تصفیہ یہ پایا کہ جتنے ڈکیتوں کے گینگ کے مقدمات ہوں وہ سب خفیہ پولیس دریافت کرے اور ان کے چالان اسپیشل مجسٹریٹی میں پیش ہوں۔ یہ طریقہ مفید بھی بہت تھا۔ کیونکہ ڈاکوؤں کے گینگ علاقۂ انگریزی سے نکل کر یہاں کے مختلف تعلقوں میں وارداتیں کرتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ ایک جگہ سے مال لوٹتے اور دوسری طرف فروخت کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر ضابطۂ فوجداری کے لحاظ سے تمام عدالت ہائے متعلقہ میں مقدمات پیش ہوتے تو گواہوں کا مختلف عدالتوں میں پھرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ خرچہ زیادہ ہوتا اور گواہوں کو خدا جانے کہاں کہاں جانا پڑتا۔ اسپیشل مجسٹریٹ کی وجہ سے یہ مصیبت باقی نہیں رہی، جبکہ گیانگ علاقۂ سرکارِ عالی میں داخل ہو کر واردات کرتا وہاں سے اسپیشل مجسٹریٹ اپنا دورہ شروع کرتا۔ ملزمین اور ان کے وکلاء ساتھ ہوتے۔ دورے پر وہی راستہ اختیار کیا جاتا جو گینگ نے اختیار کیا تھا۔ اس طرح دورے کے ختم پر تمام وارداتوں کی شہادتیں قلم بند ہو جاتیں

اور ایک ہی جگہ میں اس گینگ کے متعلق تمام مقدمات پیش ہوتے جو خاص اہمیت رکھتے ہوں یا جہاں ملزمین نے مختلف تعلقوں اور مقامات پر وارداتیں کی ہوں۔ غرض یہ ایک بڑا مفید محکمہ تھا۔ باوجود اس کے اسے توڑنے کی بیسوں کوششیں کی جاچکی ہیں، لیکن اب تک قائم ہے اور میری رائے میں قائم رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک دفعہ اس کے توڑنے کا مصمم ارادہ گورنمنٹ نے کر لیا تھا۔ اس وقت میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری تھا۔ میں نے اپنے تجربے کے لحاظ سے ایک بہت بسیط نوٹ لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا تھا اور اس تمام کام کو جو یہاں انجام پاتا ہے ظاہر کر کے محکمہ کی اہمیت بتائی تھی میری یہ رائے منظور ہوئی اور عدالت کو توڑنے کا خیال گورنمنٹ نے ترک کر دیا۔

میرے اس خدمت پر جانے سے پہلے جو صاحب اس جگہ پر کارگزار تھے، ان کا نام "پولیس کے مجسٹریٹ" پڑ گیا تھا اور اس میں کچھ اصلیت بھی تھی۔ کیونکہ ان کے اجلاس سے سو فیصدی مقدمات پولیس کے موافق طے پاتے تھے، گو مرافعہ میں ۹۹ فیصدی ٹوٹ جاتے تھے۔ اسی طرزِ عمل کی وجہ سے یہ ہوا کہ ایسے معمولی معمولی مقدمات بھی جن میں پولیس کو سزا دلانی مقصود ہوتی تھی، اسپیشل مجسٹریٹی میں پیش ہونے لگے اور اس اجلاس کے قیام کی جو غرض تھی وہ فوت ہو گئی۔ میں نے شہادت کے جانچنے میں سختی شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے سال میرے پاس پونے تین سو مقدمات پیش ہوئے اور صرف ۵۶ میں پولیس کو کامیابی ہوئی۔ اس کی وجہ سے شروع میں گڑبڑ ضرور ہوئی مگر کیونکہ مسٹر گوڈ مددگار صدر ناظم کوتوالی جو خفیہ پولیس کے افسر تھے میرے کام سے مطمئن تھے، اور میری طبیعت سے بھی واقف ہو گئے تھے، اس لئے یہ گڑبڑ دب گئی اور میں اطمینان سے کام کرتا رہا۔ اور خفیہ پولیس والے بھی ایسے مقدمات میرے اجلاس پر پیش کرنے لگے جو واقعی اہم ہوتے تھے اور جن میں شہادت قابل اطمینان ہوتی تھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر ہوتا ہے کہ سوائے ایک فیصلے کے میرے تمام فیصلے ہائی کورٹ تو کیا جوڈیشیل تک بحال رہے، جو فیصلہ ٹوٹا ہے اس کے واقعات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک بلوے میں فریقین کا چالان ہوا۔ میں نے ایک فریق کو حفاظتِ خود اختیاری کا فائدہ دیکر رہا کیا۔ اس کی نگرانی عدالت العالیہ سے نامنظور ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے فریق کی شہادتِ صفائی لینے کے بعد میں نے بعض فریقین کو سزا دی۔ عدالت العالیہ میں اس کا مرافعہ ہوا جس میں پہلے

فریق کی نگرانی ہوتی تھی۔ تصفیہ ہوا کہ اس دوسرے فریق کو بھی حفاظت خود اختیاری کا حق حاصل تھا۔ اس لئے یہ فریق بھی بری کئے گئے۔ مزا یہ کہ یہ دونوں فیصلے بطور نظیر چھپ گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ اصول قائم ہوا کہ بلوہ کرنے میں فریقین کو حق حفاظت خود اختیاری حاصل ہے۔ اور اس طرح بلوہ کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دوسرے فیصلے کا وزن چھ ہزار روپے ہے اور ایک ایسے رکن عدالت العالیہ کے قلم کا رہون منت ہے جن کے متعلق کچھ لکھنا ایک مشتہرہ امر کو بیان کرنا ہے۔ میں بھی "خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست" پر عمل کر کے اس سے زیادہ کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اسپیشل مجسٹریٹی میں کتنے اہم اور کس نوعیت کے مقدمات پیش ہوتے تھے، میں چند ایک مقامات کے واقعات بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

اس زمانے میں موضع بیوی بزرگ جاگیر رحیم الدین صاحب (نواب رحیم یار جنگ) میں ڈاکوؤں کی ایک پارٹی قائم ہوئی، جس کے سات سرغنے تھے۔ اسمٰعیل خاں، عبدالحمید خاں، جمعہ خاں، بوما، اتو خاں، عابد خاں اور اکرم خان۔ اس گینگ کا جولانگاہ اضلاع بیدر، ناندیڑا اور دیگر علاقہ جات تھے۔ اسمٰعیل خاں نہایت سفاک اور بدمعاش قسم کا آدمی تھا۔ عبدالحمید خاں افغانستان سے نیا نیا آیا تھا۔ اس کی یہ سب ڈاکو بڑی عزت کرتے تھے۔ اس کی عمر کوئی ساٹھ سال تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکے میں اگر قتل واقع ہو جاتا ہے تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے یہ اپنے سب ساتھیوں کو منع کرتا رہتا تھا (جان بچا کر کام کرو) اور یہی وجہ تھی کہ گو اس گینگ نے سیکڑوں ڈاکے ڈالے مگر کسی میں ایک بھی قتل نہیں ہوا۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ سہ پہر کے کوئی چار بجے یہ لوگ اس گاؤں میں پہنچتے تھے جہاں ان کو ڈاکہ ڈالنا ہوتا تھا اور جن مکانوں میں واردات کرنی ہوتی تھی اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے اور بندوقیں سر کرنی شروع کرتے۔ اتو خاں راستے پر قرابین لے کر کھڑا ہو جاتا۔ عبدالحمید خاں دروازے پر تعینات ہوتا۔ یہ دونوں بندوقیں چھوڑتے اور باقی لوگ مکان کے اندر گھس کر مال و اسباب لوٹتے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ گاؤں والے گوپھنوں سے مقابلہ کرتے لیکن بندوقوں کی آواز اور ان لوگوں کی سفاکی کے ڈر سے کوئی قریب نہ آتا۔ ایک دفعہ ایک گوپھن کا پتھر اتو خاں کے ایسے لگا کہ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکے کے بعد اس کے ساتھی اس کو اٹھا لے گئے۔

ڈاکے کے لئے بلحاظ ضرورت یہ لوگ دوسرے بدمعاشوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے اور بعض موقعوں پر توان کی تعداد بیس چالیس تک ہو جاتی تھی۔

اس گینگ میں سب سے زیادہ خطرناک اور نڈر ڈاکو عابدین تھا۔ اس کی عمر کوئی ۱۹-۲۰ سال کی ہوگی۔ یہ ان پٹھانوں کے ہاں کا ایک چھوکرا تھا مگر ہمت اور بے باکی میں ان سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ پوما ذات کا لمباڑہ تھا اور بڑا بہادر اور سچا شخص تھا۔ بقیہ میں جو لوگ تھے ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ عادت سے مجبور ہو کر اور روپیہ حاصل کرنے کی لالچ میں پارٹی میں شریک ہو گئے تھے۔ آخر ان ڈاکوؤں نے وہ ادھم مچایا کہ سرکار نے اسمٰعیل خاں، عبدالحمید خاں، جمعہ خاں، پوما، عمر خاں اور عابدین کو قانون کی حفاظت سے باہر قرار دیا۔ یعنی ہر شخص کو اختیار دیا گیا کہ جہاں کہیں وہ جب کہیں کسی کو نظر آئیں، وہ قتل کر دے۔ اس پر کوئی قانونی ذمہ داری عاید نہیں ہوگی۔ ۶۰-۷۰ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص کو قانون کی ضمانت سے باہر کر دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ خفیہ پولیس کی ایک پارٹی جس میں تقریباً دو سو پچاس جوان، سب انسپکٹر، انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ تھے، بیدر میں تعینات ہوئی۔ لیکن ان ڈاکوؤں کی ہمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ باوجود اس انتظام کے انھوں نے ایک دن خاص بیدر سے تین میل پر دن کے چار بجے ڈاکہ ڈالا اور دو بنیوں کے مکان لوٹ لئے۔ وجہ یہ تھی کہ بیدر اور اس کے اطراف میں مخبر لگے ہوئے تھے جو ان کو خفیہ پولیس کی حرکت اور کارروائیوں کی اطلاع دیتے رہتے تھے۔

سب سے پہلے اس گینگ سے اسمٰعیل خاں الگ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھیوں پر عرصہ تنگ ہو رہا ہے اس لئے اس نے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ اور دوسرے اس نے اپنی سفاکی سے ایک ایسی حرکت کی جس کی وجہ سے خود اس گینگ والوں نے بھی اس سے رشتہ توڑ لیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن بیدر کا ایک نوجوان محرر پولیس نہا دھو کر ٹہلنے نکلا۔ مغرب کا وقت تھا۔ بیدر کے فتح دروازے کے پاس اس کو اسمٰعیل خاں ملا اور بے چارے محرر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ (اسمٰعیل خاں) اتنا کہنا تھا کہ اسمٰعیل خاں نے بندوق اٹھا کر تڑسے فائر کر دیا اور وہ غریب وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ قتل کرنا اس گینگ کے مقررہ اصول کے خلاف تھا اس لئے اسمٰعیل خاں سے ان لوگوں نے

قطع تعلق کر لیا اور چونکہ وہ ان ڈاکوؤں کی وجہ سے خاصہ روپیہ والا ہو گیا تھا اس لئے اس نے بھی ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب وہ گرفتار ہوا تو اس کے پاس سونے کے ۱۲ کڑے نکلے۔ اس کو سونا گلانا آتا تھا۔ اس لئے لوٹ میں اس کو جو کچھ حصّہ ملتا اس کو گلاتا اور کڑے بنا کر رکھتا۔ اس کی خرید و فروخت کا یہ طریقہ تھا کہ اگر کسی سے کوئی چیز خریدنی ہو تو اس کے عوض میں کڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے دیتا۔ اسی وجہ سے ایک چھینی ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھی۔ یہاں سے نکل کر خدا معلوم یہ کیسے راجہ شیو راج بہادر کی جاگیر کے مستقر دھرم آباد میں پولیس پٹیل ہو گیا۔ لالو پٹیل اپنا نام رکھا۔ کچھ دن تو خاموشی سے کام کرتا رہا اس کے بعد گینگ بنا کر ڈاکہ زنی شروع کی۔ رات کو ڈاکہ ڈالتا صبح اس کے پاس بحیثیت پولیس پٹیل رپورٹ پیش ہوتی۔ یہ جس طرح چاہتا واقعات کو الٹ پلٹ کر پولیس میں اطلاع دیتا۔ اور کچھ اس طرح کارروائی کرتا کہ پولیس کو واردات کے ملزمین کا پتہ نہ چلتا۔ یہاں اس نے اپنی ایک داشتہ کو بھی قتل کر دیا۔ غرض ہوتے ہوتے خفیہ پولیس کو پتہ چل گیا کہ لالو پٹیل دراصل اسمٰعیل خاں ہیں۔ اس کی دریافت کے لئے منظور احمد خاں انسپکٹر مقرر ہوئے۔ دھرم آباد جا کر معلوم ہوا کہ لالو پٹیل باہر تشریف لے گئے ہیں اور شاید رات کے ایک دو بجے واپس آئیں گے۔ گاؤں کے باہر نالہ تھا۔ اس کے پاس منظور احمد خاں ہیڈ کر پٹیل صاحب کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ساری رات اسی انتظار میں گذر گئی، صبح ہو رہی تھی کہ اسمٰعیل خاں بندوق ہاتھ میں لئے اس نالے کے پاس آئے۔ منظور احمد خاں نے ان کو روکا۔ انہوں نے مارنے کو بندوق اٹھائی، منظور احمد خاں نے بڑھ کر بندوق پر ہاتھ ڈالا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ بندوق بھری ہوئی نہیں تھی اس لئے اسمٰعیل خاں نے بھاگ جانا ہی مناسب سمجھا اور وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ یہ نوجوان اور مضبوط قویٰ کے آدمی تھے تھوڑی ہی دور جا کر اس کو پکڑ لیا۔ اور بعد تفتیش یہ حضرت میرے اجلاس پر اپنی داشتہ کے قتل کے سلسلے میں پیش ہوئے۔ مقدمات کی سماعت بیدر میں ہوتی۔ کچھ گواہ حاضر نہیں تھے۔ اس لئے تاریخ تبدیل ہوئی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے خطرناک شخص کو بیدر ہی کے جیل میں رکھتے اور اگر حیدرآباد واپس ہی کرنا تھا تو لاری میں روانہ کرتے۔ مگر غلطی سے کہو یا بے وقوفی سے کہو اس کو دو جوانوں کی حراست میں حیدرآباد روانہ کر دیا۔ بیدر سے حیدرآباد کا فاصلہ ۸۵ میل ہے۔ ۱۲ میل چل کر یہ لوگ رات گذارنے موضع اکھیلی میں ٹھہرے۔ وہاں اسمٰعیل خاں نے ان جوانوں کو خوب سیندھی پلائی اور بھاگ گیا۔ اس کے بعد اس نے پھر گڑبڑ شروع کی

تھی لیکن جلد ہی پکڑا گیا اور میرے اجلاس سے اس کو ۲۰ سال کی سزا ہوئی۔ سنتا ہوں کہ تھوڑے دن ہوئے خاں صاحب اس جہان فانی سے گزر گئے۔

قانون کی حمایت سے باہر ہونے کے بعد ہی عابدین بھی ختم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ یہ کسی کام سے بندوق لے کر اسی گاؤں میں گیا۔ وہاں والوں کو خبر ہو گئی اور کوئی دو سو آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے بندوق جھٹیائی۔ موضع کا پولیس پٹیل سامنے آ گیا اور کہا کہ "بے مارنا ہے تو مجھے مار لے زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ایک آدمی مر جائے گا۔ مگر سمجھ لے کہ فائر ہونے کے بعد گاؤں والے تیری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ عابدین نے یہ سوچا کہ اس طرح مار یں کھا کر مرنے سے ایک دفعہ ہی مر جانا بہتر ہے۔ اس لئے اس نے اپنے گلے پر بندوق رکھ کر اس کا گھوڑا دبا دیا اور اس طرح اس کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

جب گورنمنٹ کو معلوم ہوا بیدر میں خفیہ پولیس کی جو پارٹی ہے وہ ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو اس کی تنظیم جدید کی گئی۔ اور عزیز اللہ جیسے ہوشیار اور کارگزار شخص کو اس کا آفیسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ عزیز اللہ مرحوم نے جاتے ہی یہ کیا کہ ان ڈاکوؤں کے گھروں کی تلاشی لی اور کسی نہ کسی طرح ان ڈاکوؤں کی عورتوں، بچوں اور رشتہ داروں کے پاس سے کوئی نہ کوئی مال مسروقہ برآمد کر لیا اور اس کے ساتھ ہی سب کے سب کو بیدر کے جیل میں پہنچا دیا۔ ان ڈاکوؤں کو خیال ہی نہ تھا کہ ان کی گرفتاری کی کارروائی یہ رنگ پکڑے گی۔ اس لئے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود گرفتار ہو کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ چنانچہ موضع بھالکی کے ایک وکیل حبیب شاہ خاں کے ذریعے سے سلسلہ جنبانی شروع ہوئی۔ عزیز اللہ مرحوم جانتے تھے کہ ان وکیل صاحب کا ان ڈاکوؤں سے کیا تعلق ہے لیکن وہ تھے بڑے پولیٹکل! اس لئے ان وکیل صاحب سے انھوں نے راہ و رسم بڑھائی اور آخر یہ طے پایا کہ سب ڈاکو اپنے آپ کو اس شرط پر گرفتار کرا دیں گے کہ ان کے جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان سب کو رہا کر دیا جائے گا۔ میں انہی مقدمات کی دریافت کے لئے بیدر گیا ہوا تھا اور اول تعلقدار صاحب کے مکان کے صحن میں عزیز اللہ، میں، نذر محمد خاں انسپکٹر، علی وسیم کورٹ انسپکٹر، حبیب شاہ خاں اور چند آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ پولیس کا جوان مکان کے باہر دروازے پر پہرہ دے رہا تھا بھاگا ہوا آیا اور کہا "سارے ڈاکو دروازے پر کھڑے ہیں اور اندر آنا چاہتے ہیں!" سمجھ لیجئے کہ اس کے اس کہنے

کا کیا کچھ اثر وہاں کے بیٹھنے والوں پڑا نہ گاجن کو تصفیے کا حال معلوم نہ تھا۔ بہر حال ان لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ملی اور وہ اونٹوں پر بیٹھے بندوقیں ہاتھ میں لئے اندر آئے۔ اونٹوں سے اتر کر ہماری کرسیوں کے قریب بیٹھ گئے شرطوں پر بحث مباحثہ ہوا۔ تصفیہ ہوا۔ انہوں نے بندوقیں اور ہتھیار پولیس کے حوالے کئے اور ان کو گرفتار کر کے جیل خانے میں داخل کر دیا گیا۔ اسی گفتگو میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ راستے سے اونٹ اور دو آدمی بیگار میں لائے ہیں اور یہ کہہ کر لائے ہیں کہ ہم سرکاری کام پر جا رہے ہیں۔ دوسرے دن ان کے عزیزوں کے مقدمات سے کوتوالی نے دست برداری لے لی اور ان کو اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اصل سارقین گرفتار ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد اس گینگ کے کوئی چالیس چالان میری عدالت میں پیش ہوئے۔ امو خاں کو سرکار نے وعدہ معافی دیا۔ اس گینگ کے جو دوسرے شرکاء تھے وہ بھی گرفتار ہوئے اور اس طرح ۶۰۔۷۰ آدمی میرے سامنے آئے۔ گواہوں کی تعداد تین سو تھی اور پھر بھی میں نے ڈیڑھ مہینے میں یہ کام ختم کیا۔ اکثر مقدمات میں یہ لوگ چھوٹے۔ بعض میں سزا ہوئی۔ بعض سے پولیس نے دستبرداری کرلی۔ مگر پھر بھی مل ملا کر ہر ایک شریک کو اتنی سزا ہوئی کہ اس کی تمام عمر جیل میں رہنے کے لئے کافی تھی۔ مجھے عبدالحمید خاں کا یہ فقرہ تمام عمر یاد رہے گا کہ جب اس سے کسی واردات کے متعلق جواب لیا جاتا تو یہی جواب ملتا "سرکار ہم کو کچھ معلوم نہیں"۔ معلوم نہیں یہ لوگ مجھ سے کیوں بہت گھل مل گئے تھے۔ جب پولیس والے موجود نہیں ہوتے تھے تو مجھ سے بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ تمثیلاً اس روز ایک مندر کے پجاری نے ان کے خلاف بڑی سخت شہادت ادا کی تھی۔ جب اجلاس برخاست ہو گیا اور پولیس والے چلے گئے تو یہ سب میری کرسی کے سامنے آ بیٹھے اور ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ "سرکار وہ پجاری بڑا بے ایمان ہے، قسم خدا کی اس نے ہم کو ایک ایک روٹی دو دو روپے کو دی اور اب دیکھو ہمارے ہی مقابلے میں گواہی دے رہا ہے"۔ میرے ان سے پوچھنے پر کہ تم اتنے عرصہ تک گرفتار کیوں نہ ہو سکے، انہوں نے جواب دیا کہ "سرکار ہم بڑی مصیبت میں تھے۔ شام کو کسی جنگل میں سوتے۔ پہرے قائم کرتے۔ گیارہ بجے پھر تبدیل مقام کرتے اور چار بجے کے قریب کسی تیسری جگہ جا کر آرام لیتے۔ کچھ عرصہ ہماری بڑی بری طرح گزری۔ اس گینگ میں سب سے ہمت والا شخص پو مالمبارڑہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ سرکار جب ہم نے جرم کیا ہے تو اس کو بیان کرتے کیوں شرمائیں۔ پہلے زمانہ ہمارے ساتھ تھا۔ اب ہمارے خلاف ہے۔ کیوں جھوٹ بول کر اپنے نامۂ اعمال میں ایک برائی کا اضافہ کریں۔ غرض مقدمات ختم ہوئے۔ تقریباً سب ملزمین کو سزا ہوئی اور جو آگ بیدر اور اس کے نواح

میں لگ رہی تھی وہ ذرا ٹھنڈی پڑی ۔

ابھی پولیس نے پوری طرح دم بھی نہیں لیا تھا کہ امو خاں کے بھائی شریف خاں نے اپنے ایک عزیز فیروز خاں کے ساتھ علم بغاوت بلند کیا۔ بیوی بزرگ کی گڑھی پر قبضہ کر لیا۔ گاؤں گاؤں سے پرانی وضع کی توپیں لا کر فصیل پہ چڑھائیں اور ادھر ادھر سے مار پیٹ کر کئی سو من بارود اور پتھر کے گولے جمع کئے۔ گڑھی پر ایک بڑا سا دھونسا (ڈھول) رکھا۔ ایک جھنڈا بلند کیا اور اس حصۂ ملک کے مالک بن بیٹھے۔ اب ان کا گینگ بیوی سے باہر جاتا، مال و اسباب لوٹ کر لاتا۔ گڑھی کے دالانوں کو قالینوں، گاؤ تکیوں اور خوبصورت جھاڑ فانوسوں سے سجاتا۔ شریف خاں مسند پہ گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے۔ نواح کی رنڈیاں پکڑ لائی جاتیں۔ دیگیں پکتیں، کھانے بٹتے اور اس طرح نوابی کی شان دکھائی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے اس گینگ کو کچھ اہمیت نہیں دی۔ اس لئے بجائے خفیہ پولیس کے ڈی ایس اضلاع کو اس کی گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ ضلع بیدر کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محمد اسمٰعیل خاں کوئی دو سو جوانوں کو لے کر بھالکی پہنچے، جہاں سے بیوی کوئی آٹھ بارہ میل ہے۔ دو تین روز کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ گڑھی پر حملہ کر کے ان لوگوں کو گرفتار کیا جائے۔ لائن باندھ کر باجے بجاتے ہوئے یہ جمعیت بیوی پہنچی۔ گڑھی کا ایک رخ میدان کی طرف ہے، اور بقیہ تین رخوں پہ گاؤں ہیں۔ انہوں نے میدان کے رخ سے حملہ کرنا چاہا۔ بگلر نے تیاری کا بگل بجایا کہ اتنے عرصے میں گڑھی سے ایک آدمی نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سفید جھنڈی تھی۔ چونکہ یہ باقاعدہ قاصد بن کر آیا تھا اس لئے حملہ روک لیا گیا۔ اس نے آ کر کہا "شریف خاں نے مجھے یہ اطلاع دینے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ گرفتار ہو جائیں ورنہ جمعیت حملہ کرے گی۔ شریف خاں نے جواب دیا کہ میری طرف سے اپنے افسروں سے کہہ دو کہ اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو توپوں میں آگ دے دی جائے گی۔ یہ سن کر قاصد نہایت ٹھاٹھ سے رخصت ہوا۔ حملے کا آغاز ہوا۔ جمعیت سے فصیل کوئی تیس چالیس قدم رہ گئی کہ تیس چالیس توپوں کے فیر ہوئے اور اس کے بعد جو یہ جوانان کوتوالی بھاگے تو بھالکی میں آ کر دم لیا۔

اس کی خبر صدر کو ہوئی اور پھر عزیز اللہ صاحب ان لوگوں کی گرفتاری کے لئے مقرر ہوئے۔ انہوں نے بجائے حملہ کرنے کے چالوں کا جال پھیلایا اور رفتہ رفتہ شریف خاں کے سارے ساتھیوں کو توڑ لیا۔ اب رہ گئے کون؟ شریف خاں اور فیروز خاں! ان دونوں کو پکڑ لینا کیا مشکل تھا۔ گاؤں سے ہو کر چند آدمی

رات کے وقت گرفتار ہو گئے۔ یہ دونوں کے دونوں شراب پیئے پڑے تھے، گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد ان کے دوسرے ساتھی بھی گرفتار ہو گئے اور سب کے سب میرے اجلاس میں پیش ہوئے۔ شریف خاں کو دیکھ کر واقعی افسوس ہوتا تھا۔ کوئی ۱۷۔۱۸ سال کی عمر تھی۔ صورت شکل بہت اچھی تھی۔ بڑا سمجھدار تھا۔ گواہوں پر جرح اس طرح سے کرتا تھا کہ کوئی وکیل بھی کیا کرے گا۔ لیکن مجھے اس سے تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے افعال کو جرم تو کیا برا ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اوّل درجے کا سفاک تھا۔ نو برس کی عمر میں ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ بوجہ کمسنی جرم نہیں سمجھا گیا اور اس کو عدالت سے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد بارہ برس کی عمر میں دوسرا قتل کیا۔ اس کی کمسنی کا لحاظ کر کے صرف چند مہینے کی سزا ہوئی۔ جیل میں رہ کر یہ اور پختہ کار ہو گیا۔ آخر سولہ برس کی عمر میں بھرے بازار میں آ کر دو آدمیوں کو مار ڈالا۔ چونکہ اس کے بعد یقین تھا کہ اب عدالت سے رعایت ہونے کی توقع نہیں اس لئے یہ ڈاکو ہو گئے اور اپنے بزرگوں کے سزا پانے کے بعد ان کی جگہ انہوں نے حاصل کر لی۔

شریف خاں اور فیروز خاں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شریف خاں صاف گو اور سیدھا سادا الڑ کا تھا۔ مگر یہ حضرت اوّل درجے کے بد معاش تھے۔ اس گینگ کے دوسرے لوگ تو ڈاکے میں مال واسباب لوٹتے مگر یہ اس گھر کی عورتوں کی عزت لیتے۔ شریف خاں گو اس تماشے میں بادشاہ اور یہ وزیر تھے۔ مگر ان کا اثر شریف خاں پر ایسا تھا کہ رفتہ رفتہ سب کچھ ہو گئے۔

یہ گینگ بیدر کے جیل خانے میں تھا، وہاں فیروز خاں نے یہ مشورہ دیا کہ مجھے جیل سے کسی طرح نکال دو تو میں عام گواہوں کو ختم کئے دیتا ہوں۔ اور جب گواہ ہی نہ رہیں گے تو سزا کس طرح ہو گی۔ انکی تجویز پر سب راضی ہو گئے۔ جو راشن ان لوگوں کو ملتا تھا۔ اس میں سے تھوڑا بہت چھپاتے جاتے تھے اور اس طرح انہوں نے کھانے پینے کا اتنا سامان اس لئے جمع کر لیا کہ کئی دن تک فیروز خاں کو کھانے کی تکلیف نہ ہو۔ آخر ایک دن کسی نہ کسی طرح رات کو اسے جیل سے نکال ہی دیا۔ اور اس نے جا کر اردگرد کے مواضعات میں ہلچل مچا دی۔ گولی بغیر تو بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مانک راؤ صاحب وکیل کو عین شہر کے دروازے پر آٹھ گولیاں ماریں۔ مگر وہ بھی ایسے سخت جان تھے کہ اتنی گولیاں کھا کر بھی بچ گئے۔ چند گواہوں کو بھی زخمی کیا۔ بہت سی عورتوں کی عصمت دری کی۔ غرض بیدر کے گرد و نواح کے سب لوگ اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ آخر ایک دن ایک میدان میں اسے گھیر کر اور مار مار کر اسکے

ٹکڑے کر ڈالے۔

باقی گینگ کو اکثر مقدمات میں سزا ہوئی۔ اب سنتا ہوں کہ شریف خاں اور جمعہ خاں کارروائیوں کی کچھ غلطی سے ابھی حال میں قبل از وقت چھوٹ گئے ہیں۔ شریف خاں پھر اودھم مچا رہا ہے۔ لیکن جمعہ خاں اس جیل کی ٹھوکر سے بیدار ہو کر سنبھل گئے تھے اور ابھی تھوڑے دن ہوئے اس ناپاک دنیا سے کوچ کر گئے۔ ہیں جس زمانے میں گلبرگہ شریف کا سشن جج تھا تو یہ جیل خانے کی ایک کارروائی میں شہادت دینے میرے اجلاس پر آئے تھے۔ داڑھی بہت بڑھالی تھی۔ ماتھے پر نمازیں پڑھنے کی وجہ سے گٹھا بھی آ گیا تھا اور اپنی غلطیوں کو سمجھنے بھی لگے تھے۔ ان کی آواز سے میں نے ان کو پہچانا اور انہوں نے اجلاس ختم ہونے کے بعد میرے چیمبر میں اپنے جور وستم کا اعتراف بھی کیا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ سرکار میں شریک تو ضرور رہتا مگر لوٹ مار میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ یہ لوگ زبردستی مجھے پکڑ کر لے جاتے تھے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ یہ آخری فقرہ کہہ کر اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی، سزا تو ہو ہی چکی تھی۔ اب جھوٹ بولنے سے معلوم نہیں اس کا کیا فائدہ تھا۔

امو خاں کے تیسرے بھائی نصر اللہ خاں بھی کچھ دنوں کے لئے پانچوں سواروں میں شریک ہو گئے تھے۔ شریف خاں کے مقدمات میں ان کا کام پیروی کرنا تھا۔ اس گینگ کے سزایاب ہونے کے بعد انہوں نے ہاتھ پیر نکالے اور ترکیب یہ کی کہ کوتوالی میں مخبری بھی کرتے رہے۔ لیکن یہ ایک ٹانگ سے لنگڑے تھے، اس لئے جلد ہی ان کا پتہ چل گیا اور یہ بھی چالان ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔

اس کے بعد ایک دوسرے صاحب کے واقعات کو لیجئے۔ ان کا نام عبد الرحمٰن سوداگر تھا۔ نظام آباد کے کسی موضع میں رہتے تھے اور بظاہر چوڑیوں کا بیوپار کرتے تھے۔ دورے پر نکلتے اور جب واپس آتے تو ہزار دو ہزار روپیہ لے کر آتے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ سفر میں جب کسی روپے پیسے والے کو دیکھتے تو اس کے ہمسفر ہو جاتے۔ موقع پاکر اس کو دھتورا دیتے اور اس کا مال لے کر فرار ہو جاتے۔ ان کی کارروائیوں نے ایسی وسعت پکڑی کہ حیدرآباد تو رہا ایک طرف، بمبئی، مدراس اور ممالک متوسط سے ان کی گرفتاری کے انعام مقرر ہو گئے۔ مگر باوجود اس کے یہ لنگڑے تھے اور بآسانی ان کی شناخت ہو سکتی تھی، یہ اپنی چالاکیوں سے گرفتار نہ ہو سکے۔ واڑی سے کچھ رنڈیاں اور ان کے ساتھی ناوندگی آ رہے تھے، یہ بھی اسی

درجے میں بیٹھے راستے میں میل جول بڑھایا اور ناوندگی آکر سب نے مل کر سرائے میں قیام کیا۔ انہوں نے رات کو جلیبیاں بازار سے لاکر نیاز دی، جلیبیاں تقسیم کیں اور سب کو "چکت" کر دیا اور ان کا مال لیا اور رات کی گاڑی سے ناندوڑ آئے۔ یہاں کسی گاؤں سے چند بیوپاری دھوتیاں خریدنے حیدرآباد آرہے تھے۔ انہوں نے اپنی دھوتی انہیں دکھا کر باور کرایا کہ ایسی دھوتیاں محبوب نگر کے بازار میں ۱۲-۱۲ آنے میں ملتی ہیں۔ وہ لوگ محبوب نگر چلنے کو تیار ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ ایسی دھوتی حیدرآباد میں کسی طرح دو ڈھائی روپے سے کم نہیں مل سکتی۔ آخر پانچ آدمی وہ اور چھ یہ تانگوں میں بیٹھ کر محبوب نگر آئے۔ یہاں شام کے وقت پہنچے۔ مسٹر عبدالرحمن نے یہاں بھی گڑ پر نیاز دی۔ گڑ تقسیم ہوا۔ وہ لوگ دیوانے ہو گئے اور یہ انکے کوئی ہزار بارہ سو روپے لے کر بھاگ نکلے۔ رات کے کوئی دو بجے پولیس کے گشت کے جوانوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ بازار کی دکانوں کے قفل توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے سب کو گرفتار کر لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ ان کو ڈاکٹر کے پاس پیش کیا گیا۔ اس نے قے کرا کے ان کا علاج کیا۔ جب ان کے ہوش و حواس درست ہوئے تو انہوں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ چونکہ عبدالرحمن صاحب کی کارگزاریوں سے پولیس پوری طرح واقف تھی اور ان کا حلیہ بھی ہر تھانے میں پہنچ چکا تھا اس لئے باوجود اس کے کہ وہ عید کا دن تھا، محبوب نگر کے سب انسپکٹر سرورالدین صاحب نے چاروں طرف آدمی دوڑائے اور خود بھی ریل میں بیٹھ کر ان کی تلاش کو نکلے۔ محبوب نگر سے ۱۴ میل کے فاصلے پر جڑچرلہ کا اسٹیشن ہے۔ مسٹر عبدالرحمن محبوب نگر سے یہاں تک پیدل آئے اور یہاں ٹکٹ لے کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ سرورالدین صاحب کے جوانوں نے گاڑی کے مسافروں پر نظر ڈالنی شروع کی۔ ان کی یہ حالت تھی کہ جونہی کوئی جوان ان کی گاڑی کے پاس سے گزرا اور یہ ذرا تختے کی آڑ میں ہو گئے۔ ان کے اس طرح کرنے سے ایک جوان پولیس کو شبہ ہوا۔ اس نے سرورالدین صاحب سے جا کر کہا۔ انہوں نے آکر ان کو گاڑی سے اتارا۔ ان کا لنگڑا کر چلنا تھا کہ شبہ کو تقویت ہو گئی اور یہ گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے پاس پسے ہوئے دھتورے کی ایک تھیلی اور لال مرچوں کی ایک تھیلی نکلی۔ ان کا چالان بھی میری عدالت میں پیش ہوا۔ ان حضرت نے دھتورے کی قسموں پر جو جو سوالات ڈاکٹروں سے کئے ہیں ان سے واقعی ان ڈاکٹروں کو چکر آگیا۔ اور اس کے بعد جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ جناب والا یہ تو بتائیے کہ کس قسم کا

دھتورا ایک نوجوان آدمی کو تھوڑی دیر کے لئے دیوانہ کر دیتا ہے اور جب میں سب لوگوں پر برابر حصۂ نیاز تقسیم کرتا تھا تو پھر سب پر خواہ وہ جوان ہو یا بچہ، عورت ہو یا مرد یکساں اثر کیوں ہوتا تھا، اور ان میں کبھی ایک بھی ضایع نہیں ہوتا تھا تو اس کا ایک ڈاکٹر صاحب بھی جواب نہ دے سکے۔ میں نے سب ڈاکٹروں سے یہ سوال کیا کہ دھتورے کی تھیلی کے ساتھ ملزم کے پاس سے مرچوں کی تھیلی کیوں نکلی ہے۔ لیکن اس کے متعلق کوئی صاحب بھی مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ آخر سزا ہونے کے بعد انہوں نے اس معاملے کو حل کیا۔ میرے چیمبر میں آکر کہا۔ "سرکار بات یہ ہے کہ دھتورہ تو میں سب کو برابر دیتا تھا مگر جب یہ لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے تو بچوں، عورتوں اور کمزور قوٰی والوں کو زبردستی اتنی مرچیں کھلا دیتا تھا کہ اس سے دھتورے کا اثر کم ہو جاتا تھا۔" سزا کے بعد یہ حضرت جیل میں رکھے گئے اور بطور خاص ہدایت کر دی گئی کہ ہر شخص کو ان سے بچے رہنا چاہئے کہ کہیں یہ وارڈنوں پر اپنے دھتورے کا تجربہ نہ دہرائیں۔

اب سنئے کہ پائیگاہ کمیشن کے سلسلے میں کچھ راز کے کاغذات چھپوانے مجھے دارالطبع جانا پڑا۔ یہ مطبع جیل خانے کے اندر تھا۔ ایک روز جو اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر عبد الرحمٰن نہایت اطمینان سے سید پیران سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میری آنکھ خطا کر رہی ہے مگر جب وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی عبد الرحمٰن صاحب سوداگر ہیں، بڑے متقی اور پرہیزگار بن گئے ہیں، اور اب جیل کے مہتمم صاحب ان کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ واپس آتے ہی میں نے صدر ناظم صاحب کوتوالی کو اس کی اطلاع دی اور اس کے بعد ان کی عزت وعظمت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد ایک تیسرے رنگ کے مقدمے کو دیکھئے۔ تعلقہ بھینسہ کا مستقر مد معول ہے۔ یہاں ایک صاحب میراں محی الدین نامی رہتے تھے۔ ان کے رعب اور ظلم و زیادتی کا یہ حال تھا کہ جس شخص کی زمین چاہتے کسی کو دلا دیتے۔ ساہوکاروں سے دستاویزیں اور بہی کھاتے چھین کر پھاڑ ڈالتے۔ کسی عہدیدار کو خاطر میں نہ لاتے۔ غرض وہاں کے مالکِ کل بن گئے تھے۔ آخر خفیہ پولیس نے ان پر ہاتھ ڈالا۔ گرفتار ہوئے اور میرے سامنے لائے گئے۔ ان کے رعب کی وجہ سے شہادت پیش نہ ہو سکی کہ ان کو سزا ہو سکتی۔ اس لئے یہ بری ہوئے۔ فیصلہ سنانے کے بعد میں نے ان کو چیمبر میں

بلایا اور کہا دیکھو میراں محی الدین میں نے ان مقدمات سے تم کو رہا کیا ہے لیکن مجھ کو اس کا یقین ہو گیا ہے کہ ان مقدمات میں اصلیت ضرور تھی۔ اگر تم بھلے آدمی ہو تو اپنا رویہ درست کر لو ورنہ یاد رکھو کہ اگر اس کے بعد تمہارا کوئی مقدمہ آیا تو کافی شہادت نہ ہونے کی صورت میں بھی تم کو جیل بھیج دوں گا۔ انہوں نے یہ سن کر بہت توبہ تلّا کی اور مجھے بعد میں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنی حالت کو درست بھی کر لیا ہے۔ ان کے چھوٹنے کے کوئی دس برس بعد میں حیدرآباد کے اسٹیشن پر شاید گلبرگہ شریف جانے کے لئے کھڑا تھا، ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور میرے پاؤں پر گرنے لگا۔ میں نے اسکو اٹھایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میراں محی الدین صاحب ہیں۔ میں نے کہا کہو کیسے ہو؟ کہنے لگے "سرکار آپ نے مجھے بڑے عذاب سے نجات دلائی اور میں سمجھ گیا کہ میں بہت غلط راستے پر چل رہا تھا۔ اب میرے کپڑے کی دوکان ہے۔ اچھی طرح چل رہی ہے اور خدا کے فضل سے میرے بال بچے دل جمعی سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ اس روز مجھ کو چیمبر میں بلا کر نہ سمجھائے ہوتے تو یقیناً میں اپنے پرانے راستے پر چلا جاتا۔" میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ ایک ملزم کا راہِ راست پر لانا سو ملزمین کو سزا دینے سے بہتر ہے۔ ایک عرصے تک مدصول میں لوگوں کے بیچ بنے رہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔



جوگندر پال

سلوٹیں

دادی امّی کی کہانی

بچپن میں ہمیں دادی امی ایک کہانی سنایا کرتی تھیں کہ کسی راجہ کو ایک سانپ ہر سال عین ایک ہی دن ایک ہی وقت پر آکر کاٹ لیتا، راجہ خواہ اپنے محل میں ہوتا یا محلوں سے باہر، خوابیدہ ہوتا یا بیدار، سانپ باقاعدگی سے آتا اور اسے کاٹ کر چلا جاتا، اور راجہ کا خون اور پھیکا پڑ جاتا، اس کے پٹھے اور کمزور ہو جاتے، وہ موت کے اور قریب چلا آتا۔

____ اور اس وقت ٹائم کلاک سے نصف شب گزرنے کی صدا بلند ہوئی ہے اور آج اس وقت میرا ساٹھواں جنم دن شروع ہو گیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ دادی امی کی کہانی میں کتنی سچائی تھی۔ وقت کا سانپ پچھلے ساٹھ سال سے ہر سال عین اسی لمحے میرے پاس آ رہا ہے۔ میں یہاں وہاں، کہیں بھی ہوتا ہوں، خوابیدہ یا بیدار، سانپ کہیں سے رینگتا رینگتا آپہنچتا ہے اور مجھے کاٹ کر چلا جاتا ہے اور روز بروز میرا خون پھیکا پڑ رہا ہے، موت قریب تر چلی آ رہی ہے۔

فنِ افسانہ

"سب سے بڑا کہانی کار وہ ہے جو اپنی کہانی کی تصنیف کے لئے ایک لفظ کا بھی محتاج نہ ہو۔"

"مگر ایسا کہانی کار ہے کون؟"

"وہ شخص، جو خود کہانی بن جاتا ہے۔ وہ اس قدر حقیقت پسند ہوتا ہے کہ تحریر کو زندگی کا جواز نہیں سمجھتا اور صرف جی جی کر نسلوں کو اپنی کہانی سونپ جاتا ہے۔"

عمرِ حیات

کئی جاندار ایک لمحہ جیتے ہیں، کئی ایک صدی، کیا یہ فطرت کی بے انصافی نہیں؟"
"نہیں، کیونکہ گزرے ہوئے ایک لمحے اور ایک صدی میں کوئی فرق نہیں۔ زندگی بہرصورت حال ہی کا ایک لمحہ ہے!"

میرا نام

اجنتا کیوز کی تصویروں کو وضاحت سے بیان کر کے گائڈ مجھ سے کہنے لگا کہ یہ پتہ ابھی تک نہیں چل سکا کہ ان شاہکار تصویر کا خالق کون ہے۔

"میں بتاؤں؟"

لیکن اس کا تضحیک آمیز احترام محسوس کر کے میں بات کو ٹال گیا۔ دراصل میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے ہی یہ آرٹ آج سے کئی صدیاں پہلے پیش کیا تھا اور اس وقت میں اپنی بنائی ہوئی تصویروں کا ہی مطالعہ کر رہا ہوں اور میرا نام — انسان ہے!

صرف ایک بار

میری بیوی دو سال کینسر کے موذی مرض میں مبتلا رہی۔ بیچاری دن رات چارپائی پر پڑی رہتی۔ اپنی موت سے ایک روز پہلے وہ کمرے سے باہر میٹھی میٹھی دھوپ پر اپنی بجھی بجھی نظر جما کر کہنے لگی "میری ایک خواہش پوری ہو جائے تو میں بڑے چین سے مروں گی۔"

"کہو" میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دوں گا۔

"میں چاہتی ہوں کہ ایک بار میں بھی باجی کی طرح بال دھو کر سر کھولے سارا دن دھوپ میں بیٹھی رہوں۔"

میں اس کے چہرے کی طرف بے صبری سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی پوری خواہش بیان کرے۔

"بس میں یہی چاہتی ہوں۔"

وسعتیں

پیدائش پر میں اپنی ماں کی گود میں پڑا رہتا، ذرا اونچا ہوا تو ماں کی گود تنگ محسوس ہونے

لگی اور میں سارے گھر میں گھومنے پھرنے لگا، پھر محلے میں اور پھر سارے شہر میں۔ مگر جوانی میں مجھے اپنا شہر بھی چھوٹا لگنے لگا اور میں اپنے سارے وطن میں رہنے لگا، عمر وہیں بیت گئی اور جب بوڑھا ہوا تو وطن کے اطراف میں بھی گھٹن کا احساس ہونے لگا اور کل جہاں میں رہائش پذیر ہو گیا۔

لیکن آخر کل جہاں بھی مجھے ماں کی گود کے مانند تنگ معلوم ہونے لگا اور میں اس جہان سے بھی اٹھ گیا!

قانون فطرت

ہوتے ہوتے ساری بستی کے غریبوں میں ہیضہ پھیل گیا اور پھر یہ ہوا کہ نگر سیٹھ کو بھی جو اُن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا کسرِ شان سمجھتا تھا، اس بیماری نے آن دبوچا۔

ایک غریب آدمی نے یہ خبر سنی تو کہنے لگا۔

"سیٹھ کا سکہ اپنا ہو تو ہو، مگر چھوت کی یہ بیماری اسے سبق دینا چاہتی ہے کہ دکھ سب کا سانجھا ہے۔"

جنت و جہنم

اوّلین آدمی کو پہلے پہل کئی دوسری اشیاء کی طرح نہ ہنسنا آتا تھا اور نہ رونا اور اسی لئے نہ وہ جنت میں تھا نہ جہنم میں۔

اور پھر اس نے ہنسنا سیکھا تو خدا کی جنت آباد ہو گئی۔

اور شیطان نے اطمینان سے مسکرا کر اپنے آپ سے کہا کہ اب میرا جہنم اپنے آپ آباد ہو جائے گا۔

آزادی

ہر مفکر اپنی فکر کی معراج پر پہنچ کر اس لئے مر جاتا ہے کہ اب اس کی فکر زبان کی محتاج نہ رہے۔

فن اور حقیقت

کہانی اس وقت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے جب وہ سچا واقعہ معلوم ہو اور سچا واقعہ اس وقت، جب وہ کہانی سی لگے۔

حیرت

جب ہم نے اپنے مکان میں بجلی کے پنکھے فٹ کروالیے تو دادا جی نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنس کر کہنے لگے "آج سے کوئی چالیس برس پہلے جب میں پہلی بار بجلی کا پنکھا گھر لایا تو میرے دادا بڑے حیران تھے کہ اس جادوئی مشین سے کیا مزے کی ہوا نکلتی ہے۔"

"ہاں" میری بیوی انھیں بتانے لگی "مگر آج کے مشینی دور میں آپ کے پوتے کی حیرت کا باعث یہ ہے کہ اس جادوئی مشین کے بغیر ہی خدا کی قدرت سے فضا میں ہوا کیسے بکھر جاتی ہے۔

بینائی

"بابا، تم ہر وقت اپنی آنکھیں بند کیوں رکھتے ہو؟"

"باہر اندھیرا ہو بابا، تو کھلی آنکھوں سے بھی کچھ نظر نہیں آتا، مگر باہر روشنی ہو تو بند آنکھوں میں بھی محسوس ہوتی رہتی ہے۔"

نان سنس!

"تم نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا؟"

"ہاں، وہ میری محبوبہ بن کر رہنا چاہتی تھی۔"

"اور محبوبہ —— ؟"

"بیوی بن کے، اس لئے اسے بھی چھوڑ دیا۔"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا، تم ——"

"تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اب محبوبہ سے شادی کر لوں اور بیوی سے عشق کروں؟ نان سنس!"

تحفظ

کرشن پرشاد پندرہ سال سے سرکاری نوکر تھا لیکن اس کی پوسٹ عارضی تھی۔ بے چارے کا یہ سارا عرصہ اسی تگ و دو میں بیت گیا کہ کسی طرح ملازمت میں اس کا قیام مستقل ہو جائے۔

اور آخر اسے سرکاری آرڈر مل گیا کہ اس کا قیام اب مستقل ہو گیا ہے۔ وہ جامے میں پھولا نہ سماتا تھا کہ اب چین سے ہمیشہ یہیں رہوں گا۔ لیکن اسی اثنا میں اچانک اسے خدائی حکم موصول ہوا اور اس کا قیام

دنیا سے ہی اٹھ گیا۔

جنس

"ارے بھئی، یہ کیا؟ لڑکی ہو کر لڑکی کے ہی عشق میں گرفتار ہو گئیں"۔

"ہاں، اپنی جان پہچان کے سب لڑکے مجھے معشوق سے لگتے ہیں مگر یہ لڑکی، بڑا بھرپور مرد!"

ایک مشاہدہ

کئی بار رات کے وقت میں سڑک پر سائیکل چلا کر گھر آ رہا ہوتا ہوں تو میری بائیں جانب میرے ہی سائیز کا ایک سایہ ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے، نہ یہ گھٹتا ہے، نہ بڑھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میرا ایک اور سایہ ایسا ہوتا ہے جو میرے قد سے بڑا ہو کر، بے چین ہو ہو کے بڑھ پھیل کر آخر معدوم ہو جاتا ہے۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے قد سے باہر آنے کی خواہش ہی ہر سائے کو، ہر شخصیت کو اپنے قد، اپنی شخصیت سے محروم کرتی ہے۔

تنقید

جن لوگوں کو پھول، درخت یا دریا میں خدا کا چہرہ نظر آتا ہے وہ دراصل اپنے خالق کے فن کی صحت پر شک کر رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے اور یہی حقیقت خدا کے فن کا کمال ہے کہ پھول میں پھول، درخت میں درخت اور دریا میں دریا ہی نظر آتا ہے۔

آبرو

"میں ــــ میں اس کا خون پی جاؤں گی۔ حرامزادہ! لفنگا ــــ!"

"ارے بھئی، اب ٹھنڈی ہو جاؤ نا"۔

"نہیں، جب تک میں اپنی آبرو کا بدلہ نہ لوں گی، مجھے چین نہ آئے گا ــــ میں ــــ میں ــــ اس نے میری بے عزتی کی ہے"۔

"آخر اس نے کیا کیا ہے؟"

"کیا کیا ہے! مجھ سے ساری رات کا بھاؤ ٹھہرا کر اب اس کُٹنی کے پیچھے ہو لیا!"

شمیم حنفی

اِحتشام صاحبؒ

"ابّا اب میں آپ سے بڑا ہو گیا ہوں!"

یہ بات احتشام صاحب نے اس وقت کہی تھی جب وہ نویں درجے کے طالبعلم تھے، ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور ان کے والد انہیں پہلی بار کلکتہ لے گئے تھے۔

بظاہر اس جملے میں اس معصوم سے بچے کی سادگی کا پرتو نظر آتا ہے، جو بچپن اور جوانی کے سنگم پر پہنچنے کے بعد اپنے تیزی سے بڑھتے ہوئے قد کی طرف مسرت آمیز حیرت کے ساتھ دیکھ کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا۔ لیکن اپنی ان آنکھوں کو کیا کروں جو حقیقتوں سے دوچار رہنے کے باوجود خواب کی دنیا میں بھٹکنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ مجھے جب احتشام صاحب نے یہ واقعہ بتایا تو غیر شعوری طور پر میری نگاہیں تخیل کے دھندلکوں میں ایک ایسے حساس لڑکے پر مرکوز ہو گئیں جو ماضی و حال اور روایت و جدت کے دوراہے پر کھڑا ہو کر ایک لمحے کے لئے دونوں سمتوں پر نظریں دوڑاتا ہے اور اپنے ذہن کو نئی منزلوں کا متلاشی اور نئی فضاؤں سے ہم آہنگ پاکر خود کو ذہنی اعتبار سے بلند تر اور پہلے سے زیادہ باشعور محسوس کرنے لگتا ہے۔

اور یہ سچ بھی ہے کہ اپنے بچپن اور جوانی کی آخری حدوں تک پہنچتے پہنچتے احتشام صاحب ایک نئے ذہنی افق سے دوچار ہو گئے تھے۔ پورب دیس کے ایک چھوٹے سے قصبے میں انہوں نے

آنکھیں کھولی تھیں، جہاں پرانی وضع کے ایک نیم پختہ مکان کی چہار دیواریوں میں قدیم سادات کی مخصوص مشرقی تہذیب اور روایتی وضعداری، مروت، اخلاق اور شرافت کا صدیوں پرانا ڈھانچہ تنگ سامانی کے باوجود ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ نظر آتا ہے متوسط طبقے کے عام مسائل، پریشانیوں کے باوجود سفید پوشی کو برقرار رکھنے کی کوشش، مشرقی علوم اور مجلس وماتم، نشست و برخاست اور خاطر تواضع کے روایتی انداز کے تانوں بانوں میں الجھی ہوئی فضا اس فضا سے بالکل مختلف تھی، جو احتشام صاحب کو ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ملی۔ جہاں سے بڑے امتیاز کے ساتھ انہوں نے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس اسکول کی زندگی ماحول کی قصباتی زندگی سے بالکل الگ تھی۔ یہاں انگریز یا عیسائی اساتذہ تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے انجیل مقدس کی تلاوت ہوتی تھی اور نصاب تعلیم کے ہر شعبے پر برطانی حکمرانوں کی طرز زندگی اور مغربی فکریات یا جدید علوم کا عکس اس زمانے کے عام ہندوستانی مدرسوں یا اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ گہرا تھا۔ لیکن برسوں کی پرانی پوسی روایتوں کے تحفظ کا جذبہ اتنا شدید اور بزرگوں سے ورثے میں ملی ہوئی معاشرتی قدروں سے ذہنی وابستگی اتنی گہری تھی کہ مغربی افق سے امڈ کر مشرق کی ساری وسعتوں پر چھا جانے والی یہ نئی فضا احتشام صاحب میں خارجی طور پر کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کر سکی پھر بھی کان بچپن ہی سے وقت کے قدموں کی آہٹیں پہچاننے کے عادی تھے۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک نئے دور کے سیلاب کا پر شور نغمہ انہیں چونکائے بغیر گذر جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خارجیت اپنا دامن بچاتی ہی رہی، اور داخلیت نے نئے رنگ و آہنگ سے دوستی کر لی۔

پھر اسی دوران میں احتشام صاحب کو ایک بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اچانک ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شعور کی ابتدائی منزلیں طے کرتے ہوئے ذہن کے لئے یہ حادثہ محض دنیاوی انقلاب سے خود کو تنہا اور بے سہارا سمجھ لینے کا محرک نہیں بنا۔ یہ بھی ہوا کہ اب جہاں ان کے دل و دماغ کی کھڑکیوں سے مادی ضرورتوں کے مسائل نے تاک جھانک شروع کر دی وہیں تنہائی اور بے بسی کے احساس نے دھیرے دھیرے ان کے دل میں اپنی کوششوں سے کچھ کر سکنے کی آرزو، ایک بہتر زندگی بنانے کے حوصلے اور ارمانوں کی ایک خیالی دنیا کے خواب کو جنم دینا شروع کر دیا۔ یوں کہنے کو دور اور قریب کے

بہت سے بزرگوں کا سایہ سر پر موجود تھا لیکن باپ کی شخصیت میں پیار اور احتساب سے بٹی ہوئی کمندوں سے چھوٹ کر اپنے آپ کو محرومیوں کے احساس سے نڈھال کرنے کے بجائے وہ "کار زارِ حیات" کے طوفان میں کود پڑے اور زندگی کے تجربات سے اپنی جھولیاں بھرنا شروع کر دیا۔

عام طور سے یہی دیکھا گیا ہے کہ ایسے طوفانوں کی زد میں آ کر اچھے اچھوں کے ہوش بگڑ جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقتوں کے تیز دھارے شخصیت کے پرخچے اڑانے کی جگہ اس کے خواب و خیال کی راہیں بدل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن احتشام صاحب ان دونوں عالموں سے بچے رہے۔ یوں بھی انہیں شاید بچ ہی جانا چاہئے کیونکہ گھر کے پیار نے باہر کی دنیا میں سنبھل سنبھل کر چلنا اور روئیوں کے احترام نے نئے تصورات کو بھی سوچ سمجھ کر دھیرے دھیرے قبول کرنا سکھایا تھا۔ چنانچہ کچی عمر میں حادثاتِ زمانہ کے تھپیڑے کھانے والا سمٹا سمٹایا شرمیلا نوجوان وقت کے لمحہ بہ لمحہ وسیع تر ہوتے ہوئے افق میں خود کو اس طرح نہ گم کر سکا کہ اس کا وجود موہوم ہو کر رہ جاتا۔ شہر کے پرکشش ہنگاموں میں دیہات کے پرعظمت سکوت کی یادیں دم نہ توڑ سکیں اور مزید تعلیم کے شوق میں الہ آباد آنے کے بعد بھی یہ نوجوان دو مختلف سمتوں کو جانے والی سڑکوں کے دوراہے پر کچھ دیر کے لئے ٹھٹکا پھر پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگا۔

یہ ذہنی کشمکش اور To be or not to be کا مسئلہ سائے کی طرح احتشام صاحب کا تعاقب کرتا رہا۔ بی۔ اے میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کی بعد کسی استاد کے مشورے پر ادبیات انگریزی کے ایم۔ اے کلاس میں داخلہ لے لیا۔ پھر چند بزرگوں کے مشورے سے اور وکالت کے شوق میں قانون کا کورس جوائن کر لیا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد اس زمانے میں شعبۂ اردو کے صدر مرحوم سید ضامن علی صاحب کے اصرار پر شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھے لیکن ہماری زبان و ادب کے لئے وہ ساعت شاید نیک تھی کہ پہلی کوشش میں چند نمبروں سے رہ گئے اور دوبارہ اس طرف توجہ نہیں کی۔ ادب سے دلچسپی ان کی افتادِ طبع پر غالب آ گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب میں ترقی پسندی کی لہر نے تخلیقی کرب سے دوچار رہنے والوں کے درک و شعور کو اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ آزاد اور حالی کب کے جا چکے تھے لیکن ان کی صدائے بازگشت ان کی اصل آواز

سے زیادہ گونجیلی اور قوی تھی۔ الہ آباد میں بھی ایسے لوگوں کا اچھا خاصا حلقہ تھا جو اس نئی آواز پر عاشق ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب بھی اس حلقے میں شریک ہو گئے۔ آخر کہاں تک بچتے۔ آگے چل کر اس لہر نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی اور "باغی" نوجوانوں کے ساتھ ساتھ چند سٹھیائے بزرگوں کی اجتماعی کوششوں سے اس کے خدوخال تیزی سے ابھرتے گئے۔ گاؤں کی بھولی بھالی فضا میں احتشام صاحب نے صرف پنگھٹ کا حسن، برسات کی بہاریں اور کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی بالیاں نہیں دیکھی تھیں اور صرف ملہار اور برہا کے گیت یا رہٹ کی روں روں سے ابھرنے والا اداس نغمہ ہی نہیں سنا تھا بلکہ زمینداروں کے مظالم، فرسودہ اور بیمار رسم و روایات کی زنجیریں، بھوک، قحط، افلاس اور بدحالی کی تصویریں اور سماجی و ذہنی پستی کے زندہ ڈھانچے بھی دیکھے تھے، اور بوڑھے سود خواروں کی دوپہر کے سورج کی کرنوں جیسی سفاک اور تیز نگاہیں بھی پڑھی تھیں۔ چنانچہ اس نئی آواز میں انہوں نے اپنی آواز کو پا لیا اور دریچے کی حدوں سے باہر نکل آئے۔ شخصیت نے کھلے میدان میں آکر اطمینان کی ایک سانس لی۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت تک ان کے افکار کی دنیا بڑی تنگ تھی۔ چند گنے چنے مذہبی موضوع یا کبھی کبھار اپنے سوز دروں کی آنچ سے کم از کم وقتی ہی طور پر خود کو بچانے کے لئے ہلکے پھلکے مزاحیہ خاکے اور بس، جن کے اوپر "سید احتشام حسین رضوی ماہلی" کا لمبا چوڑا لیبل چسپاں رہتا۔ لیکن اس تحریک کے ساتھ ایک ایک کر کے ساری بندشوں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں اور انکی شخصیت میں چھپی ہوئی آزاد پسندی کو اپنے اظہار کے لئے نئی راہیں مل گئیں۔ اب وہ صرف سید احتشام حسین رہ گئے تھے۔

ہیملٹ Hamlet کی نفسیاتی کشمکش کا وہ دائرہ، جہاں To be or not to be کا مسئلہ لگاتار کچوکے لگاتا رہتا تھا اب خود بخود پھیل کر بکھر گیا۔ احتشام صاحب نے اب اپنے آپ کو پا لیا تھا۔ اب سحر البیان کی طلسماتی فضاؤں، اطلس و کمخواب کے زرنگار پردوں، سطحی لیکن کیف آگیں محبت اور اس کی جلوہ سامانیوں، رنگ، حسن اور خوشبو کی کرشمہ سازیوں کے تانے بانے میں بھی ان کی بے حد روشن اور ذہین نگاہیں الجھ نہ سکیں۔ وہ اس فضا میں پلنے والے کرداروں کو ٹٹول کر اپنے مطلب کی چیزیں نکالتی رہیں اور ناچ گانے کی دھوم، حسن و شباب کی کافر ادائیوں اور رنگ رلیوں

کی قوس و قزح کے نشے میں خود کو کھونے کے بجائے اس فضا میں اس عہد کے ہندستان کو دیکھتی رہیں مطالعے کی
وسعت کے ساتھ ساتھ کائنات کی حدیں بھی نئی وسعتوں کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔

ایک روز ایک صاحب نے۔۔۔ احتشام صاحب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ جب بھی ادب کی باتیں کرتے
ہیں سب کچھ کہہ جاتے ہیں بجز "ادب کے"، یکھوڑی بہت ترمیم و اضافے کے ساتھ میں نے یہ بات کتنوں کی زبان سے
سنی ہے۔ لیکن ان میں بیشتر وہی بزرگ شامل رہے ہیں جنکی انگلیاں وقت کی نبض سے زیادہ اپنی داخلیت
کی رگ پر ہوتی ہیں۔ جن کا تصور بہت تابناک، بہت پر کیف اور بہت خوبصورت ہونے کے باوجود برف کی
سلیوں کی طرح منجمد ہوتا ہے، جو تاریخ کے جدلیاتی ارتقاء کو عملی زندگی یا مادیت کا بس ایک ادنیٰ سفر
سمجھتے ہیں، اور نور و نکہت سے معمور تخیل کی وادیوں میں نہ تو صنعتی ترقی کے ہنگاموں کا شور سننا پسند
کرتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طلسماتی فضا کے پردوں سے ذہنی و اقتصادی انقلابات یا سیاسی،
سماجی، معاشرتی اور معاشی استحصال کے خلاف ہونے والی انسانی جدوجہد کے سائے جھانکتے دکھائی
دیں۔ وہ چاہتے ہیں ان کی داخلیت کے شیش محل پر خارجی حالات کی پرچھائیں نہ پڑ سکے اور زندہ حقیقتیں
ان کے خوابوں کا تعاقب نہ کر سکیں۔ دل کی کارفرمائیوں میں دماغ کی کارفرمائیوں کا "زہر" نہ شامل
ہونے پائے اور سرزمین خواب (Eldorado) کے رنگا رنگ نقشے دیکھنے کے بعد عقلیت کا قلم
ایک بار گی یہ جملہ نہ ٹپکا دے کہ "اس کے بعد آنکھ کھل گئی!"

اسی طرح احتشام صاحب کے بارے میں یہ رائیں بھی خاصی عام ہیں کہ ان کی تحریریں الجھی ہوئی
ہوتی ہیں۔ وہ غلطی سے کوئی شگفتہ جملہ کبھی لکھ جائیں تو نظر ثانی میں اسے کاٹ دیتے ہیں۔ اپنے
موضوع کا جائزہ لیتے وقت وہ متعلقہ سماجی حالات کی الف، بے سے ابتدا کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ
باتیں کس حد تک صحیح ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان آراء پر غور کرتے وقت میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ جن
تصورات کی بنیادوں پر ان کی عمارت کھڑی کی گئی ہے وہی ٹیڑھے ہیں اور شاید اسی لئے مجھے اس عمارت
کی دیواریں تاثریا کج ہی دکھائی دیتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنے شعور کے ابتدائی سفر میں احتشام صاحب کی شخصیت جس نفسیاتی کشمکش
سے دوچار رہی ہے، جنون و خرد کے جس دوراہے پر بار بار ٹھٹکی ہے، عقل و وجدان کے سنگم پر

جس طرح رک رک کر آگے بڑھتی ہے اور بڑھ بڑھ کر پیچھے ہٹتی ہے۔ روائت اور جدت کے تانوں بانوں میں جس طرح الجھ کر نکلی ہے اور ماضی و حال کے تصادم سے ابھرنے والی آواز جس طرح قبول کی ہے اس منزل سے نکلنے کے بعد کوئی بھی دوسری منزل اسے اپنے دام فریب میں گرفتار نہ کر سکی۔ حقیقت اور سراب کا فرق وہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ ان کی آواز ایک عہد کی آواز بن گئی جس میں ماضی کی فتح و شکست کے نشیب و فراز، انسانی تاریخ کی پیچیدگیوں کے طلسم اور خواب و حقیقت کے مدو جزر سبھی کی تھرتھراہٹیں شامل ہیں لیکن اس آواز پر ایک بیدار، ذی شعور، متحرک، صحتمند اور توانا دل و دماغ کی مہر بھی دور ہی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے فکر و خیال کی ساحریت سے ان کی آنکھیں بند نہیں ہو جاتیں اور حسن بیان کی صہبا ان کے دماغ کو سلا نہیں دیتی۔ کسی جذبے کی تحریک پر غور کرتے وقت وہ ان مادی وجوہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتے جن سے اس نے اپنی غذا حاصل کی ہو اور یہ طرز فکر ان کا شناختی کارڈ بن چکی ہے جسے پہلی ہی نظر میں پہچانا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود ایک دلچسپ واقعے سے دو چار ہو چکا ہوں۔

ایک انٹرویو میں ممتحن نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ محمد حسین آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے جو خاکہ آپ نے مرتب کیا ہے اس کی ابتدا کس طرح ہوتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی و سماجی کشمکش، برطانوی تسلط سے پیدا شدہ مختلف ذہنی و فکری رجحانات اور ان رجحانات کے ردعمل کے طور پر ظہور میں آنے والے نشاۃ الثانیہ کو میں نے اپنے موضوع کا پس منظر بنایا ہے کیونکہ اردو ادب میں جدت اور عقلیت کی جو لہریں اس دور میں ابھریں ان کے سوتے حالات و واقعات کے اسی سرچشمے سے پھوٹے تھے۔

اور میری بات ختم ہوتے ہی ممتحن نے ایک تبسم زیر لب کے ساتھ کہا "آپ کے نگراں غالباً احتشام صاحب ہیں"

یہ سنتے ہی میں سوچنے لگا کہ میں ہی کیا وہ سارے لوگ جن کے شعور نے احتشام صاحب سے اکتساب فیض کیا ہے فکر و نظر کی سنجیدہ فضا میں اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتے کیونکہ احتشام صاحب خود کوئی راز یا پہیلی نہیں رہ گئے ہیں۔ وہ ایک مخصوص طرز فکر کا استعارہ اور ایک تحریک کی علامت

بن چکے ہیں۔ ان کی انفرادیت ہر رنگ میں نمایاں ہونے کی قوت حاصل کر چکی ہے اور ان کا شعور ہر طلسم کو جھان پھٹک کر اپنا سفر طے کرنے پر قادر ہو چکا ہے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ اس صحت مند، توانا منفرد آواز کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں شرافت، اخلاق، مروت اور نیک نفسی کے روایتی معیار کی جو قندیلیں روشن رہی ہیں انھوں نے ان کی پوری شخصیت کے گرد ایک ہالہ کھینچ دیا ہے۔ یہ ہالہ ان کے وجود میں چھپے ہوئے باغی انسان کو گھن گرج کے ساتھ کچھ کہنے، ایک کھلی ہوئی شاہراہ کو پا لینے کے باوجود گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر تیز تیز چلنے اور ادب کا ایک متعین ورروشن تصور رکھتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بے لگام چھوڑنے یا کسی ادیب و شاعر کی شخصیت کے ان اسرار کو بے نقاب کرنے سے روکتا ہے، جن سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ ہو۔ جو اپنے ارمانوں کو بھی اپنے دل کے سامنے دہرانے میں جھجھکتا ہو، جس کی زندگی "لے سانس بھی آہستہ" کی تفسیر بنی ہوئی ہو، جو اپنی آرزوؤں کی شکست پر جھنجھلانے میں اپنے آپ سے شرماجاتا ہو، جو اپنی تنہائیوں میں بھی شدت احساس سے بے قرار ہو کر اپنی آواز کو ایک حد سے آگے جانے سے روکتا ہو بھلا دوسروں کے بارے میں کچھ کہتے وقت اس کی آواز میں تیزی کیسے آسکتی ہے۔ یہ نرم آہنگی اور آہستہ خرامی بادی النظر میں احتشام صاحب کے پورے وجود پر فسردگی کا غبار بن کر چھا جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی شخصیت کا تیکھا پن ایک نامعلوم سی اداسی اور بے دلی کی دھند میں لپٹ کر ہلکا ہو گیا ہے جس میں ایک دھیما دھیما سا سوز تپش نہیں، جس میں لہریں تو بیدار ہوتی ہیں لیکن تلاطم کی حد تک نہیں پہنچتیں، پاس وضع کے ان دیکھے پہرے دار احساس کے دروازوں پر ہر وقت اپنی نظریں جمائے رہتے ہیں اور نہاں خانۂ دل میں جلتے ہوئے آرزوؤں کے چراغ کی لو جہاں تیز ہوئی یہ دروازے فوراً بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ رچی ہوئی فسردگی اور نہہ در نہہ اداسی اوروں پر بار نہیں بنتی۔ اس میں دھرتی کے سینے پر پھیلی ہوئی اس چاندنی کا جادو ہے جو خود اپنے معنی خیز طلسم سے بے نیاز اور اپنے سوزِ خنک سے لاپروا نظر آتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ وضعداری کمزوری کی حدوں سے جا ملتی ہے جس کا انتقام وہ اپنے آپ سے لیتے ہیں۔ وہ ان کتابوں پر بھی بیش لفظ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جنھیں وہ

درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اپنے ضروری کاموں کا حرج کرکے دوسروں کی معمولی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی کی دل شکنی نہیں کر سکتے، مجھے خود معلوم ہے کہ ایک صاحب نے اپنے بارے میں چند الفاظ لکھوانے کے لئے اس حد تک ناطقہ بند کر دیا تھا کہ انہیں ٹالنے کی ہزار کوششوں کے باوجود انہیں ٹال نہ سکے اور ان کے تقریباً روزانہ نازل ہونے والے خطوط جن کی مجموعی تعداد کم و بیش چالیس رہی ہوگی، بالآخر اپنی محنتوں کا ثمرہ پا لینے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے یہ منظر بھی بارہا دیکھا ہے کہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے عالم میں بھی بڑے ضبط و نظم کے ساتھ اچانک وارد ہو جانے والے کسی ایسے شخص کی باتیں گھنٹوں سنتے رہیں گے جو محض گفتگو برائے گفتگو کے مرض کا شکار ہو۔ ان کے ماتھے پر ایک بھی شکن نہیں ابھرے گی۔ گو کہ کسی اور نے اگر اتنی کشادہ پیشانی پائی ہوتی تو ایک ساتھ ہزار شکنوں کو اسکی وسعت میں سمیٹ لیتا۔

اس کمزوری نے بعض لوگوں کو ان کی ادبی حیثیت پر انگلی اٹھانے کے موقعے ہی نہیں دیئے بلکہ ان کی شخصیت بھی خاصی مجروح کی ہے۔ احتشام صاحب کے شب و روز میں جانے کتنے ایسے لمحے آئے ہیں جب انہوں نے کسی ناخوشگوار واقعہ پر کچھ کہہ سن کے دل کی بھڑاس نکالنے کے بجائے اندر ہی اندر اس نشتر کو چھپایا ہے جو احساس کے دروازے پر گھنٹوں دستک دیتا رہا، جانے کب تک وہ اس سوزِ دروں کی آنچ میں تپا کئے ہیں اور رات کی تنہائیوں کے جانے کتنے لمحے انہوں نے ایک شدید کرب و بیقراری کے عالم میں گزارے ہیں۔
اس طرح وہ شخصیت جو زمانے کے گرم و سرد کو جھیل کر پختہ ہوئی ہے اور جس نے حوادث کے تھپیڑے کھا کھا کر اپنی منزل پائی ہے اور حالات کے گرداب میں بھی اپنی انفرادیت کو ڈوبنے سے بچایا ہے وہ اوپر سے اپنے وجود کی بس پرچھائیں نظر آئے گی۔۔۔۔ ایک سائے کی طرح دھیمی دھیمی، متین، خاموش، سنجیدہ اور پروقار! اور اسے پہلے پہل دیکھنے والا شاید جلدی یہ سوچ بھی نہ سکے کہ اس سائے کی تہہ میں زندہ حقیقتوں کے کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔

وضعداری کے ایک ہمیشہ بیدار رہنے والے احساس کے ساتھ ساتھ احتشام صاحب کے مزاج میں ایک فطری شرمیلا پن ہے پہلی ملاقات میں کبھی کبھی یہ شرمیلا پن دیکھنے والے کو پرغرور متانت کی ایک ایسی دیوار نظر آتا ہے جس کا درمیان میں حائل ہونا شاید اچھا نہ لگے۔ لیکن یہ شرمیلا پن

جو احتشام صاحب کے خلوص کو فوراً بے باک ہو کر بیباک اور گرم جوشی کی حد تک پہنچنے سے روکتا ہے وہیں ان کی شخصیت میں ایک ایسی دلکشی کا اضافہ کرتا ہے جس کا لطف اٹھانے کے لئے انہیں محض دیکھ لینا کافی نہیں ہے۔ وہ تبسم زیر لب کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں کبھی یہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی کہ قہقہے کے جھکولوں میں ان کے "تجلیٔ طور کو بشرمانے والے" دانتوں کا جلوہ نظر آجائے۔ لیکن موٹے فریم کے چشمے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی، روشن اور بے حد تیز آنکھیں بہت جلد اپنی ذہانت، خلوص اور اعتماد کی کمندیں ڈال دیتی ہیں۔ ان آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی ایسا لگتا ہے کہ ان کی تہہ میں جانے کتنے اسرار اور اپنے زخموں کے علاوہ ایک زمانے کے غم کا احساس چھپا ہوگا لیکن ان سے امڈتی ہوئی بیداری ان رازوں کو اظہار کے ساحل تک پہنچنے نہیں دیتی۔

اس شرمیلے پن نے ان میں بڑی دلکشی اور ان کی بے پناہ سادگی میں بڑی پرکاری پیدا کر دی ہے لیکن خود انہیں بڑے چرکے بھی لگائے ہیں۔ احتشام صاحب کا سماجی رتبہ بہتوں کے لئے قابل رشک ہو سکتا ہے لیکن مجھے اس بات میں شک ہے کہ انہوں نے اسے کبھی اپنی انفرادی ضرورتوں کی تکمیل یا اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے کا وسیلہ بھی بنایا ہے۔ میں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ انہیں جب اپنے چھوٹے بچے اقبال کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرانے میں تھوڑی سی الجھن کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے چپ چاپ اسے ایک کمتر درجے کے اسکول میں ڈال دیا اور جب کبھی اچانک کسی سفر کے موقع پر اگر پہلے سے ریزرویشن نہیں ہو سکا تو برتھ پر خوب پھیل کر لیٹے ہوئے مسافر سے اک ذرا سمٹ جانے کی درخواست کرنے کے بجائے وہ اس ضروری سفر سے بچنے کے حیلے ڈھونڈنے لگے۔ شاید اسی شرمیلے پن نے انہیں امریکہ اور یورپ میں ایک برس گزارنے کے بعد بھی اپنی شخصیت پر مغربیت کی آنچ آنے سے محفوظ رکھا۔ وہاں بھی وہ مختلف علمی، ادبی اور تہذیبی اداروں کی زیارت کرتے رہے، لائبریریوں اور میوزیمس کے چکر لگاتے رہے اور انگلستان، امریکہ اور فرانس کے دانشوروں، عالموں اور ادیبوں سے باتیں کرتے رہے۔ تہذیبی زندگی کے مطالعے سے دلچسپی تھی اس لئے انگریزی، امریکی اور فرانسیسی فلمیں بھی دیکھ لیں ورنہ شاید تھیٹر اور اوپرا کی حدوں میں قدم رکھنے سے کترا جاتے۔ نئی فضاؤں کے سمندر میں اترنے کے بعد بھی وہ مستقل طور پر اپنی انفرادیت کے ساحل پر نظریں جمائے رہے۔

لیکن یہ انفرادیت احتشام صاحب کے شعور کے ذہنی وعلمی سرمایہ کو اکٹھا کرنے کی راہ میں کبھی نہیں اڑی اور شعوری سفر میں کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنی اس کی وجہ احتشام صاحب کی پوری شخصیت کا احاطہ کرنے والی علم کی وہ پیاس، سب کچھ جاننے اور سمجھنے کی وہ جستجو اور نئے آفاق سے روشناس ہونے کی وہ شدید خواہش ہے جو ان کی شخصیت کے ہر پہلو اور ہر افتاد پر غالب آجاتی ہے۔ وہ بے حد پڑھتے ہیں۔ اور پڑھنے سے زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کا مطالعہ چند انے گنے موضوعات کا پابند نہیں ہوتا کیونکہ ادب کو اپنے مطالعے کا مرکز بنانے کے باوجود وہ اسے زندگی کے دوسرے شعبوں اور علوم وفنون کی دیگر شکلوں سے بے نیاز نہیں سمجھتے۔ یہ وحدت ان کے نزدیک کثرت کا جوہر ہے۔ وہ زندگی کے ہنگاموں اور کسی بھی طرح کی عملی سیاست سے حتیٰ الامکان اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی کون ومکاں سے پار ہو جانے والی نظر، ان سب کا مفہوم سمجھ لیتی ہے۔ ادب کے ساتھ ساتھ وہ فلسفہ، تاریخ معاشیات، کلچر مصوری اور موسیقی، نفسیات اور عمرانیات اور یہی نہیں بلکہ سائنس کی گوناگوں کرشمہ سازیوں، آئن سٹائن کے نظریات اور زمان ومکاں کے جدید ترین تصورات میں محض دلچسپی ہی نہیں لیتے بلکہ ان سے ایسی واقفیت بھی رکھتے ہیں جو کتنوں کے نزدیک قابل رشک ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان احاطۂ تحریر وتقریر میں آنے والی کوئی بھی بات بہت سی باتوں کا مرکب بن جاتی ہے اور ادبی تنقید یا مطالعے کے روایتی انداز پر جان دینے والوں کو ان کی گفتگو الجھی ہوئی، بہکی ہوئی اور ادب پر باتیں کرتے وقت ادب سے کترا کر دوسری دنیاؤں میں بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شعر کی تشریح کرتے وقت وہ محض الفاظ کے سیدھے سادے معنی بتا دینے یا اس کا مفہوم بتا دینے پر اکتفا نہیں کرتے۔ یہ تشریح ایک فکری سفر بن جاتی ہے جس کی منزل میں وقت کے کتنے نشیب وفراز اور زندگی کے کیسے کیسے موڑ شامل ہو جاتے ہیں اور ان کی نگاہ ایک اکیلے رخ کا پردہ چاک کرتی ہوئی پس منظر کی بیکراں وسعتوں پر پھیل جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کچھ لوگوں نے احتشام صاحب سے زیادہ پڑھا ہو لیکن ان کی عام گفتگو سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حافظے میں مطالعے کا ذخیرہ حسن ترتیب، تہذیب اور سلیقے کے ساتھ محفوظ ہے اس کی مثال شاید آسانی سے نہ مل سکے گی۔ یہ سلیقہ اور ترتیب ہر گفتگو میں یکساں طور پر برقرار رہتی ہے اور اس کی سحر کاریاں سننے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ان کی زبان سے یورپ کے حالات سنتے

وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ پوری فضا متحرک ہو کر سامنے آگئی ہے۔ ان کی گفتگو کی دل فریبیوں کے دو ایک واقعات کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے جب احتشام صاحب آئے تو وائس چانسلر نے انہیں ریسرچ کے طلباء کی انجمن کا صدر بھی نامزد کر دیا۔ انجمن کی ایک تقریب میں احتشام صاحب اراکین سے متعارف ہوئے۔ معاشیات کے ایک ریسرچ اسکالر سے ملتے وقت یوں ہی روا روی میں انہوں نے اس کے موضوع سے متعلق بھی چند باتیں کیں اور آگے بڑھ گئے لیکن میں نے دیکھا کہ اس طالبعلم کی آنکھوں میں وہی پاکیزہ چمک عود کر آئی تھی جو علم کی عظمت اور تقدس کے اعتراف کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا "جی چاہتا ہے احتشام صاحب کو اپنا نگراں بنا لوں"

اس اظہار میں جذبے کی شدت سے پیدا ہونے والے مبالغے کی آمیزش تو ہو سکتی ہے لیکن اس میں چھپی ہوئی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح قومی یک جہتی کے موضوع پر ان کی تقریر سننے کے بعد سیاسیات کے ایک مشہور پروفیسر نے یا ہندی ادب کے مختلف پہلوؤں پر ان کی گفتگو سن کر ہندی کے ایک ممتاز ادیب نے بھی کم و بیش ایسے ہی تاثر کا اظہار کیا تھا۔ سیاسیات کا ایک پروفیسر یا ہندی کا ایک ادیب اپنے موضوعات سے جتنا قریب ہو سکتا ہے احتشام صاحب یقینی طور پر ان سے اتنے زیادہ قریب نہ ہوں گے۔ لیکن جس طلسم کی کرشمہ سازیوں نے انھیں اس درجہ مسحور کیا وہ میرے خیال میں احتشام صاحب کے حافظہ میں محفوظ مطالعے کی وہی ترتیب اور سلیقہ اور ان کا منفرد انداز گفتگو ہے۔ یہ انداز بعض لوگوں کی نظر میں احتشام صاحب کو "حوالوں کا آدمی" بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ وہی لوگ ہیں جو اس طرح اپنی ناتمام آرزوؤں کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں اور جن کی نظریں ستاروں سے آگے بسنے والی دنیاؤں تک پہونچنے سے پہلے ہی تھک جاتی ہیں۔

میں نے احتشام صاحب کو سب سے پہلے اس وقت دیکھا تھا جب وہ یونیورسٹی کے کسی کام سے الہ آباد آئے تھے اور محترمی ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے انہیں الہ آباد کی مشہور ادبی انجمن "تھرسڈے کلب" میں ایک چھوٹی سی تقریر کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہ بات تقریباً سات برس پہلے کی ہے۔ باقاعدہ ملاقات تقریباً تین برس پہلے ہوئی۔ جب وہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی جگہ کے لیے ہونے والے انٹرویو

میں امیدوار کی حیثیت سے آئے۔ میری اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خواہش پر اس دن ہاسٹل کی بزم ادب کے افتتاحیہ جلسے کا پروگرام بن گیا کیونکہ اس موقع پر پروفیسر آل احمد سرور، مرحوم ڈاکٹر زور، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر منظور رشید الاسلام وغیرہ بھی الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ بزم ادب کا سکریٹری ہونے کی حیثیت سے ان حضرات سے ملنا اور جلسے میں شرکت کے لیے آمادہ کرنا میرے ذمے تھا چنانچہ دیگر حضرات کے علاوہ میں احتشام صاحب سے بھی ملا۔ لیکن جلسے کی مصروفیتوں میں ان کے پاس زیادہ بیٹھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی احتشام صاحب اپنا تقرر ہو جانے پر الہ آباد آگئے۔

اور اس کے بعد سے آج تک برابر احتشام صاحب کو دیکھتا رہا ہوں۔ ادبی جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے، کلاس میں پڑھاتے ہوئے، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ان کی باتیں سنتے ہوئے، ملگجی شاموں میں ان کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، گھر پر جب وہ صبح صبح شیو بنا رہے ہوں یا مختلف باتیں بھی کرتے جا رہے ہوں اور اقبال کی شرارتوں سے عاجز آکر بیچ بیچ میں اسے ڈانٹتے بھی جا رہے ہوں، غرضیکہ ہر رنگ میں انہیں دیکھا ہے۔ میں نے انہیں اس عالم میں بھی دیکھا ہے کہ ایک خالص گھریلو آدمی کی طرح گھر کے کسی فرد کی علالت سے پریشان وہ ڈاکٹر کے یہاں بھاگے جا رہے ہیں اور یہ سوچ کر اکثر کڑھا بھی ہوں کہ راتوں کو اچانک اپنی طبیعت خراب ہو جانے پر وہ تنہا اور بے قرار گھنٹوں برآمدے میں ٹہلتے رہے ہیں اور نیند خراب ہو جانے کے خوف سے گھر کے کسی فرد کو جگانا بھی پسند نہیں کیا۔

میں نے جسقدر انھیں دیکھا ہے شاید اس سے زیادہ دوسروں سے ان کے بارے میں سنا ہے۔ "دانش محل" میں ان کے ساتھ بیٹھنے والے ان احباب سے جنکی شاموں میں تابناکی اسی وقت آتی تھی جب احتشام صاحب کی افسردہ اور پرسوز شخصیت کا جادو بھی شامل ہو جاتا تھا، ان طلباء سے جنھوں نے برسوں احتشام صاحب سے اکتساب فیض کیا ہے اور ان اساتذہ سے جنھوں احتشام صاحب کی رفاقت کے لطف اٹھائے، عام آدمیوں سے جو انھیں قدرے دور سے دیکھنے کے باوجود انھیں اپنے آپ سے قریب اور اپنی ہی طرح زندگی اور اس کے مسائل سے دوچار ایک سیدھا سادا انسان سمجھتے ہیں۔ مختلف شاعروں اور ادیبوں سے جنھوں نے احتشام صاحب کی آواز میں اپنی منزلوں کا سراغ پایا ہے اور اپنے شعور کو جلا بخشی ہے۔ ان دانشوروں سے جنھوں نے احتشام صاحب کے ساتھ فکر و خیال کی راہیں متعین کی ہے۔ اور ان بزرگوں سے جنھوں نے احتشام صاحب

کے ادبی مسلک پر نکتہ چینی کرنے کے باوجود ان کے لہجے کے توازن، ان کی فکر کی بلندی، ان کے خیال کی وسعت اور ان کے مزاج کی سادگی اور شرافت کا اعتراف کیا ہے۔

غرضیکہ میں یہ سمجھنے میں خود کو غلط بیانی کا قصور وار نہیں سمجھتا کہ میں نے احتشام صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی نظر کی بصیرت اور فکر کی وسعت کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا ہے، ان کے ادبی مسلک سے اپنے فرومایہ شعور کے چراغ روشن کئے ہیں۔ ان کی شفقتوں سے اپنے ذاتی غموں اور انفرادی محرومیوں میں نئی قوتیں حاصل کی ہیں لیکن میں انہیں سمجھ بھی سکا ہوں؟

وہ احتشام صاحب جو اپنی خلوتوں میں بھی خود کو اپنے آپ سے چھپاتے ہیں، جو اپنی آواز اور لہجے پر اعتماد رکھتے ہوئے بھی اس پر توازن کے پہرے بٹھائے رکھتے ہیں، جو اپنی شخصیت میں چھپے ہوئے باغی انسان کو سرکشی پر آمادہ دیکھ کر اسے پیچھے دھکیل دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جو طوفان کی خواہش رکھتے ہوئے بھی سکوں کے متمنی ہیں۔ جو ترشے ترشائے انیکھے، خوبصورت اور تڑپا دینے والے اشعار پر جان دینے کے باوجود زندگی اور بیداری کا دامن نہیں چھوڑتے جو اپنے سینے میں "حرم سرا کی نازنینوں" کی طرح چھپے ہوئے اسرار کو اپنے آپ سے سرگوشیاں کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ جو بجائے خود ایک توانا پرعظمت اور لازوال مکتبۂ فکر کی علامت ہونے کے بعد بھی کبھی کبھی اپنے آپ سے شاکی ہوتے ہیں اور بڑی افسردگی کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ "میں نے اب تک کیا ہی کیا ہے؟" انہیں سمجھنا کب آسان ہے؟

انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ "ان کی اداسی، ان کا فلسفیانہ غم، ان کا احساس تنہائی ہنگاموں میں بھی، ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔" وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ غالباً خود انہیں بھی اپنے چھپے چھپے سے خوابوں کا علم نہیں ہے۔ "شاید ان میں اتنی گہرائی اور پیچیدگی ہے جسے وہ بتا ہی نہیں سکتے۔" پھر میں ہی کیا، کوئی بھی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس نے احتشام حسین کو سمجھا ہے۔



فیض احمد فیض

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدم دیرینہ خفا ہے

ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روش آب و ہوا ہے

امڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسہ مے زہر ہلاہل سے سوا ہے

ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے

اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلہ ہے
اس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے

ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے

زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

مجبوری و دعوئی گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اخترالایمان

ساتویں دن کے بعد

غرض نقشِ ثانی ہوا جب مکمل تو دیکھا خدا نے
کہا خود سے ہی زیرِ لب مسکرا کر کہ "اچھا ہے"
اور آدمی کو جو تنہائی کا ایک احساس تھا مٹ گیا
بوئے گل کی طرح، چاند کی ضو کی مانند، نغموں کی صورت،
چلے دونوں گلگشت کے واسطے اور باغِ جناں
آج تک جو فضول ایک تخلیق تھی، ایک جنگل تھا خودرو
چمن ساز کی قوت صانعہ کا کرشمہ بنا
موجِ تسنیم و کوثر بنی راحتِ جاں فزا،
اور پھر یوں ہوا وقت جیسے گزرتا گیا
ایک احساس پھر سے ابھرنے لگا، دونوں ہیں اجنبی،
پھر وہی پہلی تنہائی شدت سے محسوس ہونے لگی
دونوں کو پھر کہیں سے یہ تحریک ملنے لگی، وہ شجر
جس کو چھونے کی بالکل اجازت نہیں، آخر ش ہے وہ کیا
اور یہ جاننے کے لئے دونوں بے چین استے ہوئے
سخت تنبیہہ کے بعد بھی، چھپ کے ممنوعہ پھل کھالیا
زلزلہ سا اٹھا، کھاتے ہی دونوں کے ہوش جاتے رہے،
اور جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ آغوشِ جنت نہیں
پاؤں سے تا جبیں، دونوں عریاں ہیں چاروں طرف ہے زمیں
دوڑ کر جسم پتوں سے ڈھانپے، لگے سوچنے کیا کریں
ایسے دن ڈھل گیا، رات نے لے لیا دونوں کو اپنی آغوش میں
آسمانوں سے دیکھا خدا نے کہا مسکرا کر کہ "اچھا ہے"،
اور عرش سے روحِ انسان میں آگیا، دوسرا ساتواں دن ہوا۔

سردار جعفری

چار نظمیں

مرے خواب

پھر مرے خوابِ تصوّر کے جواں شہزادے
مستیٔ شوق کی گلرنگ قبائیں پہنے
بزمِ امروز میں پیمانہ بکف آئے ہیں
پوچھتے ہیں کوئی پیاسا تو نہیں محفل میں
کوئی بھوکا تو سرِ راہ نہیں سوتا ہے
موجِ مے کس نے چھپا رکھی ہے میخانوں میں
بجلیاں کس نے دبا رکھی ہیں پیمانوں میں
ساقی خاموش ہے اور پیرِ مغاں شرمندہ

درد اک چاند ہے

درد اک چاند ہے
ہوتا ہے جو سینے میں طلوع
غم ہے اک نشترِ نور
جو دل و جاں کے اندھیرے میں اُتر جاتا ہے!

جب ترا نام لیا

جب ترا نام لیا دل نے تو دل سے میرے
جگمگاتی ہوئی کچھ وصل کی راتیں نکلیں
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ
سر جھکائے ہوئے کچھ ہجر کی شامیں گذریں
قافلے کھو گئے پھر درد کے صحراؤں میں
درد جو تیری طرح نور بھی ہے نار بھی ہے
دشمنِ جاں بھی ہے محبوب بھی دلدار بھی ہے

شعلہ لبی

مری شعلہ لبی
تشنہ لبی کی تکمیل
اور تری شعلہ لبی
آتشِ سیال کا جام
کر دیا جس نے حریفِ لب پیمانہ مجھے

ختر انصاری

یہ جہاں

دیدۂ عرش سے ٹپکا ہوا آنسو ہی سہی
یہ دہکتا ہوا، جلتا ہوا، پُرسوز جہاں
یہ تپش زا، تپش افزا، تپش افروز جہاں
عارضِ مہر سے ڈھلکا ہوا آنسو ہی سہی

لیکن آنسو میں دہک ہی تو نہیں ہوتی ہے
صرف ہیجانِ تپش ہی تو نہیں ہوتا ہے
جوشِ طوفانِ تپش ہی تو نہیں ہوتا ہے
تند شعلوں کی لہک ہی تو نہیں ہوتی ہے

خلد زاروں کی بھی ہوتی ہے جھلک آنسو میں
لذّتِ روح بھی ہوتی ہے، دل آسائی بھی
کیفِ شبنم بھی، گلِ نغمہ بھی، رعنائی بھی
چاند تاروں کی بھی ہوتی ہے ڈلک آنسو میں

دیدۂ عرش سے ٹپکا ہوا آنسو ہی سہی
یہ دہکتا ہوا، جلتا ہوا، پُرسوز جہاں
یہ تپش زا، تپش افزا، تپش افروز جہاں
عارضِ مہر سے ڈھلکا ہوا آنسو ہی سہی

حمایت علی شاعر

ثلاثی

ارتقاء

یہ اوج بے فراز ہے آوارہ بادلو!
کونپل نے سر اُٹھا کے بڑے فخر سے کہا
پاؤں زمیں پہ گاڑ کے سوئے فلک چلو

شاعری، پیغمبری

پھر کوئی فرمان اے ربّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر، محوِ انتظارِ جبرئیل

شاعری

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں ساحلِ بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے متاعِ دل

انتباہ

کہہ دو یہ ہوا سے کہ وہ یہ بات نہ بھولے
جم جائیں تو بن جاتے ہیں یہ کوہِ گراں بھی
ویرانوں میں اُڑتے ہوئے خاموش بگولے

شاذ تمکنت

نکہتِ آسودہ

لمس کی آنچ سے ہر پور میں مہکار سی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریانوں میں جھنکار سی ہے

آنکھیں جھکتی ہیں بہ افراطِ حجاب دوشیں
شب کے پارے ہوئے کاجل کی چمک مدھم ہے
سخنِ زیرِ لب و قوس، تبسم موہوم
احتیاط اتنی کہ کنگن کی کھنک مدھم ہے
چمپئی چھوٹ سی چھنتی ہوئی گھونگھٹ کے تلے
تیز ہے شعلۂ رُخ، دل کی کسک مدھم ہے
گل کترتی ہوئی انگڑائی کی محراب دو نیم
شاخِ ہر عضو کے غنچوں کی چٹک مدھم ہے

کون جاگا ہے دمِ صبح سرِ بالشِ ناز
زلف پُر پیچ و لباسِ شکن آلودہ لیے
موجِ انفاس میں اک نکہتِ آسودہ لیے

زبیر رضوی

مُلاقات

رات، سناٹا، در و بام کے ہونٹوں پہ سکوت
راہیں چپ چاپ ہیں پتھر کے بتوں کی مانند
روشنی طاقوں میں السائی ہوئی بیٹھی ہے
نیند آنکھوں کے دریچوں سے لگی بیٹھی ہے

دن کے ہنگاموں کی رونق کو بجھے دیر ہوئی
چاند کو نکلے، ستاروں کو سجے دیر ہوئی
اب کسی چشمِ نگہدار کا خطرہ بھی نہیں
وقت کے ہاتھ میں اب سنگِ ملامت بھی نہیں
دل جو مچلے تو کوئی ٹوکنے والا بھی نہیں
جسم پگھلے تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں

اے نگارِ دل و جاں شوق کی باہوں میں مچل
سایہ سایہ یونہی آغوشِ چمن زار میں چل
دن ستم پیشہ ہے، رازوں کو اگل دیتا ہے
رات معصوم ہے، رازوں کو چھپا لیتی ہے

شیر افضل جعفری

فلک رنگ

مری بہار پہ مائل نگارشاتِ جلی
مرے فراق میں سینہ فگار ذاتِ جلی

میں آسماں سے اُترتے سرود کی منزل
مرے لبوں پہ کنول کارِ غزلیاتِ جلی

مرے ضمیر کے حجرے میں بے نقاب ازل
مری نگاہ میں رقصاں تبسّماتِ جلی

مرے لہو سے شگفتہ ریاضِ کون و مکاں
مرے جنوں سے درخشندہ باقیاتِ جلی

میں شاہکارِ انائے الست دستِ ازل
مرے مزاج میں نعرہ زناں صفاتِ جلی

مظہرامام

کنگال آدرش

اپنے آدرش کی مفلسی مجھ پہ کیوں تھوپنا چاہتی ہو ؟
یہ محبت
جہاں پھول کھلتے نہیں
جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں
یہ محبت جو چولھے سے بستر کی بھدّی شکن تک ہی محدود ہے
یہ محبّت نہیں ، جبر ہے
خود غرض ، مادرانہ محبّت ہے

کسی شام احباب کے ساتھ دریا کنارے نہ جاؤں
کسی شب مئے ناب سے زندگی کو حرارت نہ بخشوں
کسی سہ پہر کو کسی سادہ رو سے نہ اک بار بھی مسکرا کر کہوں ــــ
"آج تم اس نئے پیرہن میں بہت خوبصورت نظر آرہی ہو !"

شاعر ندیم

حسنِ گریزاں

کہنا کبھی جو چاہوں تو نہ کہہ پاؤں کہ کیا ہے
وہ حسنِ گریزاں کہ بہت ہوش ربا ہے

ہنگامِ حیا ہاتھوں سے آنکھوں کو چھپانا
کچھ شوخی سی ہے شوخی اداسی کچھ ادا ہے

اس ڈر سے پکڑ لینا ڈھلکتا ہوا آنچل
ابھرے نہ کہیں راز جو سینے میں چھپا ہے

بیٹھی ہو اگر سامنے اٹھنے میں تکلّف
اُٹھ جائے اگر بیٹھنا پھر مرحلہ سا ہے

دو گام کبھی چلتی ہے تو بہکی سی روش سے
شاید مری نظروں ہی سے وہ لغزشِ پا ہے

ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لبوں پر ہے شکایت
نظروں کا مری اس کو بھی احساس رہا ہے

اقرار میں پوشیدہ ہیں انکار کے انداز
انکار میں اقرار کا پہلو بھی چھپا ہے

میرے لیئے ہنگامے ہیں اس دل میں بھی روشن
وہ لاکھ چھپائے مجھے اس کا بھی پتا ہے

وابستہ خوشی سے مری ہے اس کی خوشی بھی
میں روٹھ گیا ہوں تو اسے دُکھ بھی ہوا ہے

اٹھنے جو لگوں میں تو ہیں رکنے کے تقاضے
رخصت پران آنکھوں نے مرا پیچھا کیا ہے

وہ میری نگاہوں سے کہیں پردہ نہ کر لے
ڈرتا ہوں یہ کہتے ہوئے تُو میری خدا ہے

سید حرمت الاکرام

فراق — ایک منفرد غزل گو

فراق گورکھپوری دورِ حاضرہ کے ان شعراء کی صف میں آتے ہیں جن کی شاعری روایات سے مستحکم رشتہ رکھنے کے باوجود بڑا نیا پن رکھتی ہے۔ انہوں نے غزل نظم اور رباعی تینوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنی خوش فکری کے نظر فریب نقوش چھوڑے ہیں، بالخصوص ان کی رباعیوں کا ایک خاصا حصہ اردو کے شعری ادب میں اضافہ کے مترادف ہے لیکن فطری اور بنیادی طور پر فراق غزل کے شاعر ہیں نیز غزل ہی ان کے شاعرانہ کردار کی تعمیر و تکمیل کا جزوِ اول اور جزوِ غالب ہے جس سے وہ جانے، پہچانے اور مانے جاتے ہیں۔ خود فراق سے بھی استفسار کیا جائے کہ وہ اپنی غزلوں، نظموں اور رباعیوں میں کس چیز کو عزیز ترین تصور کرتے ہیں تو اس خیال کی نفی نہیں کی جا سکتی کہ ان کی نگاہِ انتخاب غزلوں ہی پر پڑے گی اور اس موقع پر میرے اظہارِ خیال کا موضوع بھی ان کی غزل گوئی ہے۔

کچھ دنوں سے فراق کے فکری تنوع اور جذباتی بہاؤ پر ماندگی سی طاری ہوتی جا رہی ہے جس کا ایک سبب ان کی پُرگوئی اور بسیار گوئی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کبھی کبھی قدیم شعراء کی طرح قافیہ پیمائی کر کے غزلوں کو طول دیتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں جس سے بعض مقامات پر خیالات کی بازگشت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کی قدرتِ بیان اور دیرینہ مشقی کا اظہار ضرور ہوتا ہے لیکن فراق کی شاعری کا وہ پہلو، جس کے وہ مدعی ہیں، چھپتا اور دبتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

فراق کئی اعتبار سے ایک امتیازی شخصیت کے مالک ہیں جو علمی وقار، نقادانہ بصیرت اور متعدد زبانوں پر ماہرانہ عبور کے خوشگوار اجزاء کا مرکب ہے۔ اردو کے قدیم شعراء کا دائرہ علم بالعموم فارسی یا فارسی و عربی سے آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ لیکن فراق نے جن زبانوں سے استفادہ کیا ہے ان میں فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت بھی ہیں جس کا اثر ان کی پوری شاعری پر نمایاں ہے۔ خصوصاً وہ ہندو دیومالا کے زبردست شیدائی ہیں جس کا اظہار وہ خود اس طرح کرتے ہیں:

"میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ چھوڑ کر کانگرس کی تحریک کے سلسلے میں ڈیڑھ برس تک قیدِ فرنگ میں رہا تو کچھ غزلیں کہنے کا موقع ملا۔ جن خوبیوں سے میں نے عام طور پر اردو کو محروم پایا تھا، ان کے علاوہ جو خوبیاں اردو شاعری میں موجود تھیں لیکن جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے تلاش اور نازک احساسات کی ضرورت تھی، انھیں بھی مشق اور غور و فکر، سماعی تخیل (ANDITORYIMIGINATION) کی مدد سے حاصل کرتا رہا لیکن شاعری ایسی کرنا چاہتا تھا، اپنے اشعار میں ایسی روح، ایسی فضا اور فضائیں ایسی تھرتھراہٹ چاہتا تھا کہ وہ تمام خوبیاں جلوہ گر اور اجاگر ہو جائیں جو اس قوم کی تہذیب میں ملتی ہیں جس قوم نے رامائن اور مہابھارت، سیتا، شکنتلا، کرشن، بدھ اور ہندستان کے قدیم آرٹ اور کلچر کو پیدا کیا اور جس کلچر پر اسلامی اور جدید مغربی تہذیبوں کے اثرات سے اور بھی جلا ہوتی گئی۔"

چنانچہ انکی غزلوں میں ہندستان کی دھرتی کی جو سوندھی خوشبو، رامائنی فضاؤں کی جو مترنم چاندنی اور رس بھری اثر آفرینی نیز قدیم تہذیبی عناصر کی جو لطافت، دلفریبی، شیرینی سادگی اور افسوں طرازی ملتی ہے، وہ کسی غیر محسوس تاثر کی دین نہیں بلکہ فکر و شعور کی راہ سے بڑے نمایاں طور پر در آئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ان بکھری ہوئی کرنوں کو اپنے ذہن

سے رفتہ رفتہ مانوس کیا اور سمیٹا ہے کیونکہ ان میں یک گونہ اجنبیت تھی اور فراق کو اپنے تصورات کی تکمیل کے لئے جہاں خود جہد و ریاض کے سخت مراحل سے گزرنا پڑا، کتنے دشت وصحرا کی خاک چھاننی پڑی جس نے کبھی کبھی ان کے تلووں کو زخمی بھی کیا وہیں بڑی خلوص مندی کے ساتھ انھوں نے غزل کی اندرونی تہوں سے بھی ناخن آزمائی کی تاکہ اس کی روح میں ان اجزاء کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا جا سکے۔ فراق کی نکتہ شناسی اور باریک بینی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ غزل کے مزاج کی ان نزاکتوں کو ملحوظ نظر رکھیں جنھیں اس کے اجزائے ترکیبی میں اساس کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اسے محسوس کیا اور اس تقاضے کی تکمیل بڑی بالغ نظری، دیانت داری اور جابکدستی سے کی۔

فراق کو اردو غزل سے متعدد شکایات تھیں۔ یہ شکایات کہاں تک حق اور بجا ہیں، ایک جداگانہ بات ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ غزلیہ شاعری پر ناکام تعیش اور لذتیت کے عناصر غالب تھے اور شکوہ و شکایت کی فراوانی تھی۔ فراق نے یہ بھی محسوس کیا کہ لہجہ میں جہاں تفکر کی کمی ہے وہاں جلاوت بھی ناپید ہے، دنیا کی پاکیزگی کا احساس بھی کم ہے اور خیر و برکت کے عناصر بھی مفقود ہیں۔ انھیں ایسی شاعری مقصود تھی جو روحانیت سے لبریز کفر (PAGANISM) کے نغمے سنا سکے لیکن انھیں اس نوع کے نمونے نہیں مل رہے تھے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ فراق غزل کو اپنے جن تخیلات و تصورات کی جولاں گاہ بنانے کے خواہاں تھے، ان کا فقدان کسی معنی میں استعجاب انگیز ہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کیا سکتا کہ اردو غزل اپنی جامہ زیبیوں، دلنوازیوں اور کشش انگیزیوں کے باوصف روایات کی بوجھل فضا میں سانس لے رہی تھی جسکو جرأت، امانت، داغ نیز اس قبیل کے شاعروں نے بیحد مسموم کر دیا تھا نیز غزل کا سفینہ ایک بحر بیکراں میں رواں ہونے کے باوجود چند گردابوں میں گھر کر رہ گیا تھا۔

ان امور کو چند دوسرے حساس اور خوش فکر شاعروں نے بھی محسوس کیا تھا جن میں اقبال، سیماب، اصغر، جگر، برج نارائن چکبست، جوش، یگانہ اور رفانی سبھی شامل ہیں اور ان کے یہاں بدلی ہوئی لَے کے ساتھ جو پاکیزگی و نفاست ملتی ہے وہ اسی احساس کا

نتیجہ ہے۔ اقبال اور جوش نے اپنے لئے جداگانہ طرز و اسلوب کا انتخاب کیا۔ جوش ایک مخصوص وقفہ کے بعد غزل کے میدان سے ہٹ گئے۔ اقبال نے نظموں کے ساتھ غزلیں بھی کہیں مگر ان کا رنگ و آہنگ دوسرے غزل گویوں سے بالکل مختلف ہے۔

فراق کی شاعری کسی مخصوص نظریہ کی پابند نہیں لیکن ان کی شاعری کو روایتی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ جدید میلانات و اقدار کی پرستاری کے باوجود انھوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کا مرکز غزل کو بنایا لیکن ان کے شعور نے جس میں نیا پن اور تیکھا پن پوری قوت و وسعت کے ساتھ موجود ہے، لیلائے غزل کے گیسوؤں کو نئے انداز سے سنوارا اور اس کے ظاہر و باطن دونوں کو نئی تجلیاں دیں جو ان کے خلاقانہ جوہر کو نمایاں کرتی ہیں۔ عشقیہ شاعری کے متعلق وہ چند نظریات ضرور رکھتے ہیں جن کا مقصد محض یہ ہے کہ غزل کو غیر ضروری اور غیر صالح عناصر سے پاک کر کے اس کی شریانوں میں تازہ لہو دوڑایا جائے جو اس کو صحت مندی و توانائی کا نیا حسن عطا کر سکے۔ وہ اپنی تصنیف "اردو کی عشقیہ شاعری" میں لکھتے ہیں:-

"پر عظمت عشقیہ شاعری کا افادی پہلو بھی ہے۔ ایسی شاعری ایک تو ہمارے ادراک و جذبات میں بڑی قوتیں اور لطافتیں پیدا کر دیتی ہے، دوسرے ایسی شاعری جنم اس وقت لیتی ہے جب عشق کی شدتیں تو صحیح و سلامت رہ جائیں لیکن اسکی کثافتیں اور آلودگیاں شعور میں اپنی ارتقائی صورت حاصل کر لیں۔ اس وقت محبت کا طوفان بھرپور ہوتا ہے لیکن اس میں ایک سکون بھی آجاتا ہے۔"

فراق اس بات کے شاکی ہیں کہ ان کے تغزل سے ابھرنے والے سوز و گداز کو فانی کی "یاسیات" کا پرتو متصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ فراق نے فانی سے اپنے شغف کا اظہار بعض موقعوں پر صراحتاً کیا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ فراق پر فانی کی شاعری کی چھاپ ہے، درست نہیں۔ فراق نے اس کی تردید خود کی ہے کیونکہ فانی کی

شاعری میں کرب وغم کی جو شدید کیفیات ہیں، ان کا بہ فراق کی شاعری میں کہیں نہیں ملتا بلکہ ان کے تغزل پر جا بجا ایک نشاط انگیز سرمستی کی پرچھائیاں اپنا عکس ڈالتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ فراق کے یہاں جمالیاتی احساس کی جو ترجمانیاں ہیں، ان کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ عشق انسان کے دل کو سوز و تپش کے ساتھ ایک خنک چاندنی بھی دیتا ہے جس کی چھاؤں میں روح کو سکون میسر آسکے۔ فراق نے اسی سکون کی جانب اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں دل کو تڑپا اور برما دینے والی جو کیفیات ہیں، وہ غم کی گتھیوں کو الجھاتی نہیں بلکہ سلجھاؤ کے قریب لاتی ہیں۔ وہ انسان کی محرومیوں، مایوسیوں اور مجبوریوں کا احساس ضرور دلاتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ زندگی میں اس کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں بلکہ وہ کیف و سرور اور نشاط و مسرت کے ان سرچشموں کا سراغ بھی دیتے ہیں جن میں زندگی کی رعنائیوں کا امرت بھرا ہوا ہے۔ ان کا عشق اور ان کا غم انسان کو دنیا سے فرار کا سبق نہیں سکھاتا بلکہ اسکے ہنگاموں میں کھو کر حیات کے مسموم گوشوں کو لہکانے مہکانے کا حوصلہ دیتا ہے وہ کہتے ہیں:

چپ ہو گئے تیرے رونے والے — دنیا کا خیال آگیا ہے

یہی وجہ ہے کہ فراق کی غزلوں میں ارضیت کی بڑی تابناک و توانا لویں ملتی ہیں جو حیات کے طوفان سے جھلملا تو سکتی ہیں لیکن اپنی شکست نہیں قبول کر سکتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

فراق اک اک سے بڑھ کے چارہ ساز درد ہیں لیکن — یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

اور انھیں کی تلقین یہ بھی ہے کہ:

ابھی تو اے غم پنہاں! جہان بدلا ہے — ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جب

فراق کا ذوق جمال ان کی رباعیوں میں بڑی سرجوشی کے ساتھ پھوٹا پڑتا ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ غزلوں میں یہ کیفیت ہمہ گیری و ہمہ جہتی کے ساتھ نہیں پائی جاتی حقیقت یہ ہے کہ

رباعی میں ابلاغ کی دھاروں کے آگے کوئی قدغن کوئی قید و بند نہیں لیکن غزل کے رنگ روپ پر روایات کی نقابیں ہیں جنھیں نوچ پھینکنا فراق جیسا غزل گو یقیناً گوارا نہیں کر سکتا، لیکن انھوں نے ان نقابوں کو برقرار رکھتے ہوئے جو نور فشانی کی ہے، وہ ایک معنی میں زیادہ نظر نواز اور روح پرور رہے۔

فراق نے غزل میں بعض ایسے مضامین کے لئے بھی گنجائش نکالی جنھیں غیر مستحسن اور کبھی کبھی غیر شریفانہ تصور کیا جاتا رہا ہے لیکن یہ مضامین ان کی شاعری میں اتنی سلیقہ مندی کے ساتھ ملتے ہیں کہ عیب ہنر بن گیا ہے، یہ عیب ان کی غزلوں میں جابجا بلکہ اکثر ملتا ہے اور تجزیہ کیا جائے تو فراق کو فراق بنانے والے عناصر میں اس عیب کی کارفرمائی بڑی دور رس ہے۔ انھوں نے جمالیاتی، جنسی اور نفسیاتی چٹخارے دیکر غزل کو وہ تازگی اور شگفتگی دی جو اس لئے بھی نہایت برمحل اور ضروری تھی کہ غزل بتدریج اپنی لطافت اور حرارت سے محروم ہوتی جارہی تھی۔ ایک طرف لذت پرستانہ اور عیش کوشانہ ماحول کا عکس لئے ہوئے وہ شاعری تھی جو غزل کے خد و خال کو مسخ کر رہی تھی اور دوسری جانب وہ بے رنگ، سپاٹ اور خشک شاعری تھی جس سے نہ روح و قلب کو کیف حاصل ہوتا ہے نہ ذہن و شعور کو کوئی غذا میسر آتی ہے۔ فراق کی اس کوشش نے، جسے ان کی طباعی اور جدت طرازی سے تعبیر کیا جائے گا، غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا جن میں محو پرواز ہو کر جدید غزل نئی رفعتوں کا سراغ لگا سکتی ہے اور لگا رہی ہے۔

فراق نے اپنی شاعری کو خود بھی عشقیہ شاعری بتایا ہے جسے (اپنے کلام پر) ان کی رائے کہنے کے بجائے ان کے دل کی آواز کہا جائے تو زیادہ بامعنی یا معنی خیز بات ہوگی۔ ان کی شاعری کو عشقیہ شاعری کے علاوہ اور کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا، چنانچہ ان کے یہاں وہ سب کچھ ہے جسکا ربط حسن و عشق کی متنوع کیفیات اور ان کے مختلف متعلقات سے ہے۔ ان کی رباعیوں کی طرح ان کی غزلوں میں بھی ایک غیر نمایاں یا غیر محسوس غنائیت ہے جو ان کے تغزل میں چنگ و رباب کی جھنکاریاں سمو دیتی ہے اور یہ جھنکاریاں ذہن سے گزر کر دل تک پہنچتے پہنچتے شبنم کی

خنک بوندوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کے شعور کے مختلف گوشوں میں چھپے ہوئے سنگیت کی نرم خرام لہریں الفاظ و معانی کے پیکر میں ڈھل جاتی ہیں یا کبھی کبھی اجنتا اور ایلورا کے ان نقوش کا روپ بھر لیتی ہیں جن کے رومانی اثرات کی رمزیت فراقؔ کے دل میں انگڑائیاں لیتی رہی ہے۔ قدیم جمالیاتی قدروں کی نیرنگی اور رنگا رنگی، ان کی لطافت اور حلاوت، ان کی درد خیزی و شفا بخشی فراقؔ کے یہاں صدہا انداز میں جلوہ گر ہوتی اور ہزاروں بھیس بدلتی ہے اور وہ تخلیقی عمل کو عصر نو کی تہذیبی و ادبی قدروں سے اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں جو بجائے خود ایک قسم کی جادوگری ہے

فراقؔ کی ایک انتہائی منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے متعدد نغموں اور مختلف دھنوں کو باہمدگر حل کر کے ایک ایسی لے تخلیق کی جسے ان کی اپنی لے کہا جا سکتا ہے اور کہنا چاہئے۔ وہ بلاشبہ اپنے کئی پیشروؤں اور ہمعصروں کی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں، خواہ اسکا سبب ذہنی ہم آہنگی ہی کیوں نہ ہو۔ ان شعراء میں، میرؔ، مومنؔ، غالبؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، عزیزؔ لکھنوی، شادؔ عظیم آبادی، یگانہؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور آسیؔ غازی پوری کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ فراقؔ کی ذہنی اور تخلیقی مشقِ سخن کا سلسلہ ایک قابلِ لحاظ وقفہ تک رہا ہے جس کے دوران وہ اپنے ذہن کے خزینہ میں بہت کچھ سمیٹتے اور محفوظ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے خود بھی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ابتداً ان کی غزل گوئی کی رفتار نہایت سست تھی اور یہ کہ شروع میں آٹھ دس سال تک ان کی آواز اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھی۔ بہر نوع ان کی شاعری دل کی شاعری ہے حالانکہ اس پر دماغ کی پرچھائیاں بھی بڑی گہری ہیں مگر انہوں نے کہیں بھی ان پرچھائیوں کو اتنا ابھرنے کا موقع نہیں دیا کہ وہ جذبات کی رنگین تصویروں کو دھندلا سکیں یا ان پر غلبہ پا سکیں۔ ان کی داخلیت بڑی تیکھی، گہری اور نمایاں ہے جو دوسری تمام کیفیات کو اپنے سیلاب میں مدغم کر لیتی ہے۔ اس کے پسِ پردہ ان کے دکھے ہوئے اور چوٹ کھائے ہوئے دل میں پلنے والی وہ دھیمی آنچ بھی کارفرما ملتی ہے جس میں ایک عاشق کا ناکام وجود پگھلتا رہتا

ہے - وہ آغازِ شباب ہی سے ایک خاموش سوزش سے دوچار ہے جو ان کی روح کی گہرائیوں میں جلتی رہی، غالباً حسن وعشق کے پاس بھی اس کا کوئی مداوا نہیں تھا اور یہ خاموش شورش فراق کی غزلوں میں الجھی خستگی و ربودگی پیدا کرنے کا سبب ہوئی جس [illegible] سے یہ کہلوایا:

مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا

لیکن فراق نے اس انفرادی غم کو بڑی پہنائی اور توانائی دی ہے نیز اس میں نفسیاتی ومعنوی بیکرانی کے عناصر سمو کر ایسی آفاقیت پیدا کر دی ہے جو انسانیت دارضیت کا ایک لامحدود دائرہ بناتی ہے اور اپنی آغوش میں ہر اس کیفیت کو سمیٹ لیتی ہے جس کا تعلق انسانی جذبات ومحسوسات سے ہو سکتا ہے فراق کو مومن اور حسرت سے نسبتاً زیادہ قریب کہا جاسکتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن ان سے فراق کی قربت محض اس لئے ہے کہ ان کی کہی ہوئی باتیں فراق کے دل کی باتیں تھیں - فراق کی غزلوں میں خارجی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو کہیں کہیں زیادہ شوخ ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لکھنوی تغزل سے کسی نہ کسی شکل میں گہرا اثر قبول کیا ہے، لیکن غالباً حقیقت یہ نہیں بلکہ اسے براہ راست ان کی تلذذ پرستی کا نتیجہ قرار دیا جانا چاہئے جو ان کی جمالیاتی حس کی تیزی اور جنسی تشنگی کی راہ سے آیا ہے جس کے اظہار کے نمونے ان کو لکھنوی شاعری کی خارجیت میں بغیر کسی کاوش وجستجو کے بافراط مل سکتے تھے - چنانچہ ان کے شاعرانہ کردار کا یہ پہلو ان کی بیشتر رباعیوں میں نہ صرف مختلف طریقوں سے نمایا ہے بلکہ ان پر حاوی ہے، البتہ بعض مقامات پر فراق نے اس سے بڑی دلکش اور خوش رنگ تصویریں بھی بنائی ہیں -

فراق کی غزلوں میں کہیں ایسی فضا بھی پائی جاتی ہے جس میں متصوفانہ عناصر گھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے - ہندی اور سنسکرت ادبیات نیز ہندو دیو مالا سے ان کی گہری شیفتگی نے جہاں ان کو جمالیات کا احساس ایک خاص سانچے میں ڈھال کر دیا اور اسکے مختلف پہلوؤں میں شدید بیداری کی کیفیت پیدا کی وہیں ان کے ذہن کو ایک رومانی لہک

سے بھی مربوط و مانوس کرنے کا باعث ہوئی جو مطلقاً غیر شعوری ہے۔ چنانچہ اسے ان کی عشقیہ شاعری کی ایک شق سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فراقؔ کی غزلوں کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں، یہ انتخاب قدرے طویل ضرور ہے لیکن اس سے ایک طرف ان کی غزلگوئی کے مختلف ادوار کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے تو دوسری جانب ان کے شاعرانہ مزاج و آہنگ کے ہر پہلو کی نمائندگی ہوتی ہے

ایک تصویر تھی وصال کی رات
آپ کے لطف انتہائی کی

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

ہم نے بھی موڑ لیا منہ دل سوزاں سے فراقؔ
کون ہوتا ہے چراغ شب تنہائی کا

دھوکا کھایا ہوگا نظر نے، دل کو وہم ہوا ہوگا
تجھ کو دیکھا ہوگا کسی نے، تجھ کو کیا دیکھا ہوگا

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں
آج بھی آنکھ لگائے رسن و دار سے ہیں

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری حرماں نصیبوں سے
کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

لے اڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

اہل غم کو تیرا پیمانِ وفا
یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

ابھی تو اے غمِ پنہاں! جہان بدلا ہے
ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

وہ عالم اور ہی ہے جس میں گہری نیند آتی ہے
خوشی اور غم میں سونے کے لئے راتیں نہیں ہوتیں

خطِ تقدیر اپنا پڑھ چکا ہوں بارہا لیکن
نگاہِ یار آخر کوئی پیغام زبانی بھی

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا
کون ہے صبح ازل سے خراماں

آئے گنہگارانِ محبت
نادم نادم نازاں نازاں

رونے کو تو زندگی پڑی ہے
کچھ تیرے ستم پہ مسکرا لیں

جھلک جسم کی ریشمی پیرہن میں
کسی دیپ مالا کی ہے جھلملاہٹ

مست نگاہیں بادل بادل شوخ نگاہیں بجلی بجلی
چال میں بادِ صبا کی لچک سی سنبھلا الھڑ پن

کچھ چونک سی اٹھی ہیں فضا کی اداسیاں
اس دشتِ بیکسی میں سرِ شام تم کہاں

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے
ہاں! دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

جیسے لہرائے کوئی شعلہ کمر کی یہ لچک
سر بسر آتشِ سیال بدن، کیا کہنا

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آ جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

محبوب وہ کہ سر سے قدم تک خلوص ہو
عاشق وہی کہ حسن سے کچھ بدگماں بھی ہو

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

پوچھ نہ عشق کی نگاہ کیسے پڑی کہاں پڑی
عقل الجھ کے رہ گئی دامِ تعینات میں

تھی ایک کاوشِ بے نام دل میں فطرت کے
سوا ہوئی تو وہی آدمی کی ذات ہوئی

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

کوئی نہیں جو ساتھ دے تیری حریمِ ناز تک
بکھرے ہوئے مہ و نجوم دیتے ہیں سب ترا نشاں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

یوں تو اپنی رام کہانی کہہ کے فراق نہ روتا تھا
آنکھیں جس سے بھر آئی تھیں نام ترا آیا ہوگا

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں جی بھر آئے تو اشک بہائیں
اک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں اے دل رو رو کے سو جائیں

میرے دارالاماں اے حریم نگار! ___ کیا پھر دل میں یوں ہی بے اماں بے اماں
ستارے چھپے جھلملا جھلملا کر ___ ترے جاگنے والے رو رو کے سوئے
بے قصور منصور کو ناحق دار و رسن پر کھینچو ہو ___ لوگو! کوئی اور نہیں یہ پردے سے ہم بولے ہیں
جانے بھی دو نام کسی کا آگیا باتوں باتوں میں ___ ایسی بھی کیا چیں لگ جانا کچھ تو کہو کیا سوچو ہو

فراق کی شاعری اپنی بعض ناہمواریوں کے تحت اکثر تنقیدی حرف گیریوں کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ بلاشبہ ان کی لغزش مستانہ زبان و بیان کی وادی میں بھی اپنی فطری وضع پر قائم رہتی ہے اور وہ اپنے شاعرانہ منصب سے کبھی عمداً اور کبھی سہواً تغافل برتتے ہوئے ملتے ہیں لیکن جہاں اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وجدانی اعتبار سے وہ مواد کی تقدیم کے قائل ہیں اور شاعرانہ صناعیوں کی خاطر اپنے کسی اچھوتے خیال کا خون کرنا گوارا نہیں کر سکتے وہیں اس کی پشت پر ان کے طبعی لاابالیا نہ پن کا بھی کچھ کم ہاتھ نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شاعر کی افتادِ طبع کا اثر اس کی سخنوری پر ناگزیر ہے جس کی زد میں ہیئت اور مواد دونوں آتے ہیں۔ فراق کو ہم ان کی بے راہ روی کے لائق درگزر تصور کریں یا نہ کریں لیکن فراق کی شاعری کے وزن و وقار کو محض چند ضوابط کی میزان کا سہارا لے کر گھٹایا یا کم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ انھوں نے زندگی کی نئی اقدار، نئے دور کی برکتوں اور نحوستوں اور فکر و شعور کی نئی پیچیدگیوں اور طرفہ گوئیوں کو حسن و عشق کے نفسیاتی عرفاں میں سمو کر غزل کو بے کراں و جاوداں بنانے میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا تقاضا کچھ اور ہے جس کے پیش نظر تاریخ ادب میں فراق کا نام ایک منفرد غزل گو کی حیثیت سے تابندہ و پائندہ رہے گا۔

— —

قومی یک جہتی بنائے رکھنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے

آنند نرائن مُلّا

فائدہ کچھ گلۂ جور سے ہوتا بھی نہیں
اور مردانِ محبت کا یہ شیوا بھی نہیں

قصرِ بیداد کو ڈھا دے ابھی ایسا بھی نہیں
آج مزدور مگر مُنہ کا نوالا بھی نہیں

شب وہ آئی ہے کہ تاروں کا دھندلکا بھی نہیں
آج دنیا کو محبت کا سہارا بھی نہیں

مجھکو گرنے کا نہیں غم مگر اس کا ہے ملال
میں تو گرتا ہی مگر تم نے سنبھالا بھی نہیں

اب تو میں تم سے بہت دُور کہیں ڈوب چکا
تم نے دیکھا ہی نہ جب میں نے پکارا بھی نہیں

تو نے اس بزم میں اے شمع فروزاں چھوڑا
شمع کشتہ کے لئے ایک پتنگا بھی نہیں

غم کی کس منزلِ عرفاں پہ ہیں اب دل کے قدم
لطف کا شکر نہیں جَور کا شکوا بھی نہیں

کرمِ شب تاب کو کَے بار ستارا سمجھا
اب مجھے اپنی نگاہوں پہ بھروسا بھی نہیں

خشک آنکھوں پہ نہ جا عشق ہے شائستہ مرا
غم کی رُت دل میں نگاہوں میں شگوفا بھی نہیں

غمِ دنیا غمِ دل اپنی جگہ ہیں دونوں
بھول جاؤں غمِ دل وہ غمِ دنیا بھی نہیں

اس جگہ آئی ہے اب کشتیٔ عمرِ مُلّا
کہ جو منجدھار نہیں ہے تو کنارا بھی نہیں

سروش صدیقی

میں نے پوچھا کہ علاجِ غم و اندوہ بشر؟
اُس نے ارشاد کیا۔ آتشِ دل، سوزِ جگر!

کچھ تو ہے بات کہ ہر لب پہ اک [illegible] ہے
کچھ تو ہے راز کہ خاموش ہیں اربابِ خبر

جب ترے وعدۂ فردا کا خیال آتا ہے
ٹوٹ جاتا ہے وہیں سلسلۂ شام و سحر

اب یہ سمجھا ہوں، حرم کیا ہے صنم خانہ کیا
تیرے جلووں نے سکھائے مجھے آدابِ نظر

سچ کہا، جلوہ گہہ ناز تو کچھ دُور نہیں
میں بہت دور ہوں اے قافلۂ شام و سحر

وحشتِ عشق نے بڑھ کر وہ قدم چوم لئے
لڑکھڑاتا ہی رہا، حوصلۂ فکر و نظر

ایک دو گھونٹ شرابِ لبِ گفتار سہی
نہ ملا آنکھ، مگر ہم سے ذرا بات تو کر

زور کچھ گردشِ دوراں کا نہیں چلتا ہے
کبھی مجھ پر ہے، کبھی تیرے تغافل پہ نظر

ہم نشیں چل کے کسی روز سروش سے ملئے
ہے وہ اس دور میں منجملۂ اربابِ نظر

احمد ندیم قاسمی

اذانِ صبح سے شب کا علاج کیا ہوگا
مجھے تو تیرا ہی چہرہ سحر نما ہوگا

اس انتظار میں تکمیلِ کفر ہو نہ سکی
کبھی تو میرا خدا بھی مرا خدا ہوگا

بہار کتنی ہی بے رنگ ہو، بہار تو ہے
جو گل نہیں تو کوئی زخم ہی کھلا ہوگا

وہ تیرگی ہے کہ راہِ وفا سے پوچھتا ہوں
تجھے تو اپنے مسافر کا کچھ پتا ہوگا

میں آج تیرے تصوّر میں مسکرا تو دیا
مگر یہ فکر ہے، کس کس کا دل جلا ہوگا

ہے میرے لمس میں اب تک ترے بدن کی مہک
تری جدائی کا حق مجھ سے کیا ادا ہوگا

ترے فراق میں بھی تجھ سے ربط قائم ہے
کہ میری یاد میں تُو بھی تو جاگتا ہوگا

مرے دیار کی مانند تیرے شہر میں بھی
اُداس رات کا سنّاٹا رو رہا ہوگا

فضا میں تیر رہے ہوں گے کتنے فق چہرے
افق کی دھار پہ مہتاب کٹ گیا ہوگا

میں کھل کے رو نہ سکا جب، تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہوگا

کرشن موھن

جاں فزا ہے جمال کی خوشبو
یہ بدن کی، وصال کی خوشبو

آ رہی ہے مرے خیالوں سے
تیری مستانہ چال کی خوشبو

اچھے کاموں سے آتی رہتی ہے
علم و فضل و کمال کی خوشبو

کیف و مستی میں شاعرِ رنگیں
سونگھتا ہے خیال کی خوشبو

اے حسین یادِ عہدِ رفتہ کی
اے رمیدہ غزال کی خوشبو

خواہشِ وصل تیز کرتی ہے
موسمِ برشگال کی خوشبو

گیسوؤں کی خنک گھٹاؤں سے
آئی بادِ شمال کی خوشبو

دورِ آئندہ سے بھی آئے گی
دورِ ماضی و حال کی خوشبو

تیرے حُسنِ جواب سے آئی
میرے رنگیں سوال کی خوشبو

زیست کو لطف خاص دیتی ہے
عاشقی کے ملال کی خوشبو

خوشنما پات پات کی رنگت
دلرُبا ڈال ڈال کی خوشبو

عشق کا انگ انگ مہکائے
حسن کے بال بال کی خوشبو

زیست بے کیف ہو کے رہ جائے
ہو نہ گر اعتدال کی خوشبو

آ رہی ہے جبینِ ناز سے بھی
عرقِ انفعال کی خوشبو

کرشن موہن کے دل سے آتی ہے
آرزوئے کمال کی خوشبو

ناصر کاظمی

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دُور نکل

ایک سمے ، ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانے پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل

ایک یہ وقت کہ تو نے مجھ کو دیکھتے ہی مُنھ پھیر لیا
ایک وہ دن جب تو نے میرے پاؤں میں رکھا تھا آنچل

یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل

میں تو ایک نئی دنیا کی دھن میں بھٹکتا پھرتا ہوں ،
میری تجھ سے کیسے نبھے گی ایک ہیں تیرے فکر و عمل

میرا مُنھ کیا دیکھ رہا ہے ، دیکھ اس کالی رات کو دیکھ
میں وہی تیرا ہمراہی ہوں ، ساتھ میرے چلنا ہو چل

خلیل الرحمٰن اعظمی

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

سونا ہوں کرید کر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں

لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں

یوں تو ہے نشاط سے بھی اک ربط
دراصل میں غم سے آشنا ہوں

نسبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں

دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں میں دعا ہوں

کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں

تقدیرِ جنوں پہ چپ رہا ہوں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں

ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

شان الحق حقّی

بکھر جائے گی شام، آہستہ بولو
ترخ جائیں گے جام، آہستہ بولو

نکل جاتا ہے نام، آہستہ بولو
زباں آئے نہ کام، آہستہ بولو

نہ دو داغوں کے بھید، آہوں کو رُو کو
نہ لو نالوں کا نام، آہستہ بولو

وہ ابھری یاد میں بھولی سی اک دُھن
یہ ہے اس کا پیام، آہستہ بولو

نہ اڑ جائیں ترانے شاخِ دل سے
بچھا رکھا ہے دام، آہستہ بولو

یہی ہوتے ہیں آدابِ محبّت
کہ جب لو اس کا نام، آہستہ بولو

نہ لے تنہائی کی راتوں میں اِک دن
خموشی انتقام، آہستہ بولو

بہت ہے صدمۂ یک آہ اس کو
ہے نازک یہ نظام، آہستہ بولو

نہ جانے کون بیٹھا ہو کمیں میں
اندھیری ہے یہ شام، آہستہ بولو

فغانِ دل سے کس کا دل پسیجا
یہ ہے سودائے خام، آہستہ بولو

ابھی تو راہ میں دیوار و در ہیں
ابھی دو چار گام آہستہ بولو

زبانوں سے زبانے اٹھ رہے ہیں
سلگ اٹھے کلام، آہستہ بولو

ابھی تو بادۂ الفت کا حقّی
پیا ہے ایک جام آہستہ بولو

ساقی فاروقی

پاؤں مارا تھا پہاڑوں پہ تو پانی نکلا / یہ وہی جسم کا آہن ہے کہ مٹی نکلا

میرے ہمراہ وہی تہمتِ آزادی ہے / میرا ہر عہد وہی عہد اسیری نکلا

ایک چہرہ تھا کہ اب یاد نہیں آتا ہے / ایک لمحہ تھا وہی جان کا بیری نکلا

موج کی طرح بہا درد کے دریاؤں میں / اس طرح زندہ بچا کون مگر جی نکلا

میں عجب دیکھنے والا ہوں کہ اندھا کہلاؤں / وہ عجب خاک کا پتلا تھا کہ نوری نکلا

جان پیاری تھی مگر جان سے بیزاری تھی / جان کا کام فقط جان فروشی نکلا

خاک میں اس کی جدائی میں پریشان پھروں / جب کہ یہ ملنا بچھڑنا مری مرضی نکلا

صرف رونا ہے کہ جینا پڑا ہلکا بن کے / وہ تو احساس کی میزان پہ بھاری نکلا

اک نئے نام سے پھر اپنے ستارے الجھے / یہ نیا کھیل نئے خواب کا بانی نکلا

وہ مری روح کی الجھن کا سبب جانتا ہے / جسم کی پیاس بجھانے پہ بھی راضی نکلا

میری بجھتی ہوئی آنکھوں سے کرن چنتا ہے / میری آنکھوں کا کھنڈر شہر معانی نکلا

میری عیّار نگاہوں سے وفا مانگتا ہے / وہ بھی محتاج ملا وہ بھی سوالی نکلا

میں اسے ڈھونڈھ رہا تھا کہ تلاش اپنی تھی / اک چمکتا ہوا جذبہ تھا کہ جعلی نکلا

میں نے چاہا تھا کہ اشکوں کا تماشہ دیکھوں / اور آنکھوں کا خزانہ تھا کہ خالی نکلا

اک نئی دھوپ میں پھر اپنا سفر جاری ہے / وہ گھنا سایہ فقط طفلِ تسلی نکلا

میں بہت تیز چلا اپنی تباہی کی طرف / اس کے چھٹنے کا سبب نرم خرامی نکلا

روح کا دشت وہی جسم کا ویرانہ ہے / ہر نیا راز پرانا لگا، باسی نکلا

صرف حشمت کی طلب، نام کی خواہش پائی / دل کو بے داغ سمجھتا تھا جذامی نکلا

اک بلا آتی ہے اور لوگ چلے جاتے ہیں / اک صدا کہتی ہے ہر آدمی فانی نکلا

میں وہ مردہ ہوں کہ آنکھیں مری زندوں جیسی
بین کرتا ہوں کہ میں اپنا ہی ثانی نکلا

اطہر نفیس

بے نیازانہ ہر اک راہ سے گزرا بھی کرو
شوقِ نظارہ جو ٹھہرے، تو ٹھہرا بھی کرو

اتنے شائستۂ آدابِ محبت نہ بنو
شکوہ آتا ہے اگر لب پہ تو شکوا بھی کرو

سینۂ عشق تمناؤں کا مدفن تو نہیں
شوقِ دیدار اگر ہے تو تقاضا بھی کرو

وہ نظر آج بھی کم معنیٔ و بیگانہ نہیں
اس کو سمجھا کرو اور اس پہ بھروسہ بھی کرو

تابہ کے شکوۂ بے مہریٔ ساقی اطہر
کبھی خود بڑھ کے کوئی جام اٹھایا بھی کرو

شرون کمار ورما

میں بوئے گُل ہوں، آہِ نارسا ہوں؟
ازل ہی سے پریشاں ہو رہا ہوں

مجھے کوئی نہیں پہچان پاتا
میں اپنی رُوح میں شاید چھُپا ہوں

گنہگارِ محبت ہوں ازل سے
میں اپنی آگ میں تنہا جلا ہوں

بڑی اُمید سے ان سے ملا تھا
بڑی حسرت سے ان کو دیکھتا ہوں

زمانے کی نظر بدلے نہ بدلے
میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

مجھے دیکھو محبت کرنے والو
بھری دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں

کمار پاشی

دنیا کے اسرار و رموز کی ایک سے ایک گرہ کھولوں
ایسے بھاگ کہاں جو بیٹھوں تجھ سے دل کا حال کہوں
رات ہے لمبی جی اداس ہے کیوں نہ کوئی تدبیر کروں
سدا سہاگن ہے ترا یہ روپ، جوانی کا سنگھار!
یہ جنگل، یہ کالے پربت گیان اجالا کیا دیں گے
جب امبر شعلے برسائے، جب دھرتی کی کوکھ جلے
لے دیکر کچھ اکھڑی سانسوں کی جھنکار ہے اپنے پاس
کیا کیا باتیں کیا کیا یادیں، کیا کیا عالم ہیں تجھ میں
کیا بتلاؤں یہی سمجھ لو، بڑا عجیب سا لگتا ہے
رکو رکو دامن پہ سجالوں جاتی رُت کا نقش کوئی
یوں تو کچھ آسان نہیں ہے پھر بھی جی میں آتا ہے
کس سے حال کہوں میں دل کا جب خود سمجھ نہیں پایا
کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے، کوئی سنے تو حیران ہو
میں بھی باقی سب بسرا دوں تم بھی ہو کر مگن سنو
جب جب بھی اس جگ میں میری آتما دھارن کرے بدن
میرے ظرف نے پیار میں مجھ کو چپ رہنا سکھلایا ہے
شب فراق کو جوں توں کر کے کاٹ دیا تو یہ جانا

بیٹھ کے دل کے آنگن میں جب تنہائی سے بات کروں
کبھی کبھی جو سامنے آئے، دیکھ کے من کو پرچالوں
خود کو اپنی کتھا سناؤں اور یونہی پہروں رو دوں
آ اے دھرتی! اپنے لہو سے آج میں تیری مانگ بھروں
کیوں نہ دل کی بات مان لوں کیوں نہ گھر کو لوٹ چلوں
ساگر ساگر بدن بھگوؤں، بادل بنکر برس پڑوں
آ۔ جیون کے آخری لمحے! تجھ کو بھی کچھ دیتا چلوں
جانے کون صدی کی گھٹنا کون صدی کا قصہ ہوں
کبھی جو تنہائی میں بیٹھ کے آپ اپنے پر غور کروں
ٹھہرو ٹھہرو اس بگیا کا ایک پھول تو توڑ ہی لوں
تو بھی اچانک آ ٹکرائے میں جو رستہ بھول پڑوں
جانے کیسا اضطراب ہے، پل پل راہ بدلتا ہوں
رہ رہ کر خود اپنے ہی دل کو تڑپاؤں اور لذت لوں
لاکھوں صدیاں بیت چکی ہوں میں جو کہانی ختم کروں
پربت پربت روپ بکھیروں، ساگر ساگر رنگ بھروں
لاکھ کہو تم، لاکھ کہہ دیدو، پھر بھی اس کا نام نہ لوں
جیون کی دکھ بھری کتھا کو بے ترتیب ہی رہنے دوں

جس کو پانے کی آشا میں تن نے سو سو رُوپ بھرے
کیا ہی خوب لمحہ ہے جو پاتی آج اسی کے ہاتھ بکوں

خورشید احمد جامی

تا حدِ نظر کوئی مکاں ہے نہ مکیں ہے
دل وقت کے مقتول فسانوں کی زمیں ہے
اوراق بہاراں کو پھر اک بار الٹ کر
دیکھو تو سہی نام ہمارا بھی کہیں ہے
اس طرح بھٹکتا ہوں اکیلا ہی اکیلا
جیسے یہ مرا شہر مرا شہر نہیں ہے
جلتے ہیں چراغوں کی طرح غم کے اندھیرے
جب سے مرے ہمراہ کوئی شعلہ جبیں ہے
ہر سمت زمانے کی وہی دھول ہے لیکن
ہر شکل ترے پیار کی دلدار و حسیں ہے
تو اور بھی راہوں سے مری دُور ہوا ہے
تو اور بھی مجھ سے مرے گیتوں کے قریں ہے
چھاتی ہیں جہاں زلفِ معنبر کی گھٹائیں
شاید مرے گیتوں کا نیا دیس وہیں ہے
یادوں کے شبستاں سے بلاتا نہیں کوئی
خوابوں کے دریچے میں کوئی شمع نہیں ہے
صدیوں سے اسی طرح بھٹکتی ہے خدائی
صدیوں سے اسی طرح خدا عرش نشیں ہے
حالات کے بڑھتے ہوئے پتھراؤ میں جامی
کچھ اور مجھے عظمتِ ہستی کا یقیں ہے

صابر شاہ آبادی

شہر میں کوئی وبا ہو جیسے
سب کو پرہیز وفا ہو جیسے

ہائے تہذیبِ وفا کی میّت
مرثیہ خواں نہ رہا ہو جیسے

پانی پانی ہے کچھ ایسی شبنم
پھول نے طنز کیا ہو جیسے

یوں تبسّم ہے لب لعلیں پہ
اس نے کچھ مان لیا ہو جیسے

بیکسی ہوتی ہے اتنی محسوس
تو بھی انجان ہوا ہو جیسے

پھول کو اس طرح چھوتی ہے صبا
آپ کا بند قبا ہو جیسے

ہائے اس دَور میں دل اے صابر
آگ میں پھول گرا ہو جیسے

رزمی صدیقی

اینگلو پاکستانی غزل

ولایت جاؤ تو اک صاحب روئے نکولانا
خیالِ یار حاجت مند رکھنا ، بلکہ ڈُو لانا

یہ ڈفرینسز بڑھے ہزبینڈ اور وائف میں آخر کیوں
برج میں ہار جانا سب ، کما کر گھر میں جو لانا

ارادہ آج پکچر دیکھنے کا ہے ، وہ آئیں تو
پلاز امیں انھیں جسٹ آفٹر دی فرسٹ شو لانا

ہمارے بوس میں صاحب بڑا بھاری ڈفکٹ اک ہے
کہ جس میٹر میں یس کہنا ، اسی میں لب پہ نو لانا

کرو حج ، تب سیاہی فسق کی زمزم سے چھوٹے گی
رہا افلاس کا دھبا ؟ ۔ یہ اسمگلنگ سے دھولانا

میاں قاری ہیں بیوی سے نہیں بنتی تلفظ پر
وہ بے ٹا کہتی ہے بیٹے کو ، مولانا کو مُولانا

تجھے تر دامنی کا ڈر ہے ، اگلا عرس آنے دے
ذرا سا آبِ غسلِ قبر سے دامن بھگو لانا

سفارت میں کوئی مس صاحبہ مل جائیں سکرٹری
تو سلکِ زوجیت میں ان کو بے کھٹکے پرو لانا

رواں رشوت کا دریا ہے گھڑا بھرنے میں ہے خطرہ
اگر موقع ملے تو تم کو بھی اک لٹیا ڈبو لانا

ادھر سے لڑکیاں گزریں تو آوازے کسے کس نے
اماں نکلا وہی کالج کے شوقینوں کا ٹولانا

مربیّ کوارٹر کی اس نے کس سنہ میں کرائی تھی
ذرا رزمی کا فائل دیکھیں ، اے ۔ ڈی ۔ آر ۔ او ۔ لانا

کنھیا لال کپور

عنوان کا مسئلہ

شاعر ہونا بھی کتنی مصیبت ہے! واللہ ہم اس بات کا شکوہ نہیں کر رہے کہ شعرا کو واہ واہ کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے ہی ان کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ خوبصورت اشعار کی تخلیق کریں لیکن ان کے لئے انھیں معاوضہ نہ دیا جائے۔ یا اتنا کم دیا جائے جس سے ان کی گزر نہ ہو سکے۔ جب ملٹن ایسے شہرۂ آفاق شاعر کو اس کے لافانی شاہکار "پیراڈائز لاسٹ" کے لئے صرف پانچ پونڈ پیش کئے گئے تو باقی شعرا کس کھیت کی مولی ہیں۔ آپ کہیں گے کہ شاید ہم اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ شعرا کو اکثر مشاعروں میں "ہوٹ" کیا جاتا ہے۔ آپ پھر غلط سمجھے۔ شاعر تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مشاعروں میں شرکت کرتا ہے۔ وہ کبھی اس بات پر پروا نہیں کرتا کہ اس کے اشعار کا خیر مقدم "سبحان اللہ"، "مرحبا"، "بہت خوب" کے نعروں سے کیا جائے گا یا اسے مطلع کے بعد فوراً مقطع پڑھنے کو کہا جائے گا۔ ہم تو صاحب اس سخت مقام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو شاعر کی راہ میں سنگِ گراں کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی اپنی نظم کے لئے مناسب عنوان تجویز کرنا۔ آپ فرمائیں گے "بھلا یہ کونسی افتاد ہے۔ آخر شاعر جس موضوع پر نظم لکھتا ہے، وہی اس کا عنوان ہو سکتا ہے۔" آپ نے بجا فرمایا لیکن اگر آپ جدید شاعری کے لوازم پیش نظر رکھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عنوان کا مسئلہ خطرناک حد تک پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ہماری اس نظم کو لیجئے جو ہم نے "آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ" میں پڑھی اور جس کا عنوان ہم آج تک دریافت نہیں کر سکے۔

چلتے چلتے ہم آپ کو ایک نقّاد کا قصہ بھی سنا دیں جن کی خدمت میں ہم اس لئے حاضر ہوئے کہ وہ اس نظم کا کوئی مناسب عنوان تجویز کریں۔ نظم سننے کے بعد وہ ہم سے پوچھنے لگے۔ "آپ کو مرگی یا خفقان کے دورے تو نہیں پڑتے؟" ہم نے حیران ہو کر جواب دیا "نہیں تو۔ یہ آپ کو کیسے وہم ہو گیا کہ ہم ان نامراد امراض میں مبتلا ہیں؟" انھوں نے دوبارہ سوال کیا۔ "کیا آپ بھنگ یا چرس کے زیر اثر تو نظمیں نہیں کہتے؟" ہم نے جب اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا۔ "آپ دماغی بیماریوں کے کسی لائق ڈاکٹر سے فوراً رجوع کیجئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دماغ چل گیا ہے یا چل جانے کی تیاری کر رہا ہے۔" ہمیں اس نقاد سے مل کر خاصی مایوسی ہوئی۔ گھر پہنچ کر ہم نے ایک اور نظم لکھی جو آپ کی تفریح طبع کے لئے پیش کرتے ہیں:-

جتنے نقاد ہیں زمانے میں
یعنی قدرت کے کارخانے میں
ان سے مل کر خوشی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی
ان سے مل کر اداس رہتا ہوں
وقف حرمان و یاس رہتا ہوں
رات آتی ہے اوڑھ کر کمبل
مسکرا کر ہے کہتی شاعر سے
کس لئے شغل آہ و زاری ہے
زندگی موت سے پیاری ہے
اٹھ کہ دنیا ہے منتظر تیری
ہر طرف بج رہے ہیں نقارے
باغ میں شور ہے عنادل کا
پالے تو بھی سراغ منزل کا

جھیل میں مینڈک بھی ہیں کچھوے بھی ہیں
آسماں میں دیکھ کر قوسِ قزح
آگیا کیوں مجھ کو پھر تیرا خیال
دیکھتا ہوں جب میں سطحِ آب پر مرغابیاں
سوچتا ہوں کاش اڑ سکتا میں شکرے کی طرح
مجھ سے تو اچھے ہیں مینڈک اور یہ مرغابیاں
جھیل ہی گہوارہ جن کا جھیل ہی جن کا مزار
کوئی کچھوا دیکھ کر مجھ کو اداس
مجھ سے ہمدردی جتانے کے لئے
پانی سے باہر بھلا آئے گا کیوں ؟
تم تو ہو مجھ سے ہزاروں کوس دور
حالِ دل تم کو سنانا ہے محال
قرض خواہ کو آج کیا دوں گا جواب
کل بڑی مشکل سے ٹالا تھا اُسے۔
کاش میں طوطا ہی ہوتا دہر میں
ٹائیں ٹائیں کرتا رہتا شاخ پر بیٹھا ہوا
دیکھتا ان سے کہ میرے سامنے جو جھیل ہے
اس میں کچھوؤں کے علاوہ چار سو مینڈک بھی ہیں۔

آپ ہی فرمائیے اس نظم کا کیا عنوان ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں گے "کچھوے اور مینڈک"۔ ہم عرض کریں گے کہ اس میں مرغابیوں اور شکرے کا بھی تو ذکر ہے۔ اس لئے "شکرا اور مرغابیاں" کیوں نہیں۔ اور آپ قوسِ قزح، کوسوں دور بیٹھی محبوبہ اور قرض خواہ کیوں بھول گئے۔ اور پھر آپ نے ان داخلی واردات کے بارے میں کیا سوچا ہے جو اس نظم کی جان ہیں۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ایسے میں وہ اگر یہاں آئے
زندگی میں بہار آجائے
یہ مگر محض ہے جنوں میرا
پی کے ٹھرا بہک گیا ہوں میں
کتنا کڑوا مزا ہے ٹھرے کا
روتے رہتے ہیں رات بھر کتے
ان کی شب کی سحر نہیں ہوتی

نظم لکھنے کو تو لکھ لی لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس کا عنوان کیا ہونا چاہئے۔ درجنوں عنوانات قائم کئے لیکن کوئی بھی پسند نہ آیا۔ آخر ایک پروفیسر صاحب سے جن کی لیاقت کی دھوم تھی، مشورہ کیا۔ وہ نظم پڑھنے کے بعد کہنے لگے "ساری نظم میں صرف دو کام کے مصرعے ہیں اور وہ غالب سے چرائے گئے ہیں۔ اس لئے نظم کا عنوان ہونا چاہئے "غالب کے ہاں ڈاکہ"۔ ہمیں ان کا مشورہ ناگوار گزرا ہم انکی لیاقت کے علاوہ ان کی نیت پر بھی شک کرنے لگے۔

انہی دنوں ایک مشہور ادبی رسالہ کے ایڈیٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نظم سننے کے بعد ان پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ جب ذرا ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو فرمایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اس نظم میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہ [illegible]ا چاہتے ہیں؟ اس کا اتا پتا نہیں لگ سکا۔ بات تو آپ نے نقادوں سے چلائی۔ اس کے بعد رات کا قصہ لے بیٹھے اور پھر نہ جانے کیوں آپ کو فضا میں نقارے بجتے سنائی دیئے۔ نقاروں سے یک لخت آپ کا تخیل عنادل کی جانب پہنچا۔ پھر آپ کو غالب کا شعر یاد آیا۔ خاتمہ آپ نے کتوں کے رونے پر کیا۔ اب آپ کی نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟ یہ کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میری مانیے تو عنوان رکھئے۔ "پی کے ٹھرا بہک گیا ہوں میں"۔ ہم نے برہم ہو کر کہا "لاحول ولا! ایسی خوبصورت نظم کا اتنا بیہودہ عنوان"۔ ایڈیٹر صاحب نے فرمایا "چلئے اس

نظم کو ہم اپنے رسالے میں بغیر کسی عنوان کے چھاپ دیتے ہیں اور قارئین سے عنوان تجویز کرنے کیلئے کہتے ہیں"۔ ہم نے ان کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہمیں منظور ہے"۔ چنانچہ نظم چھاپ دی گئی۔ ہماری توقع کے خلاف قارئین نے عجیب و غریب عنوانات تجویز کئے مثلاً "گورکھ دھندا"، "بھول بھلیاں"، "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"، "تک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ"، "ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں یہ عنوانات پڑھ کر قارئین کی عقل پر رونا آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے سخن فہمی کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا خود ہی اس نظم کا عنوان سوچیں گے۔ چنانچہ آج سہ پہر سے مغز پچی کر رہے ہیں۔ لیکن ہماری مشکل حل ہوتی نظر نہیں آتی۔ آپ نے بھی تو یہ نظم ملاحظہ فرمائی۔ آپ ہی کچھ دست گیری کیجئے۔ ہاں ذرا سوچ کر بتائیے تو کہ اس نظم کا کیا عنوان ہونا چاہیئے؟

تبصرے

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں از ڈاکٹر سید عابد حسین قیمت ۸ روپے
ناشر:— مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اقیت کسی قسم کی ہو، نہ صرف اپنے لئے بلکہ اکثریت کے لئے بھی بہت سے پیچیدہ سوالات اور مسائل کا موضوع بن جاتی ہے۔ اس ملک میں جو مذہبی، لسانی، طبقاتی، معاشی تہذیبی اور علاقائی رنگا رنگی ہے اور اس نے علیحدگی پسندی کے جو رجحانات پیدا کئے ہیں اس نے مسئلہ کا حل تو دور رہا، اس کے سمجھنے میں بھی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ ہندوستان میں ان کی تقریباً ہزار سال کی تاریخ، ریاست، تصوراتی ارتقا، حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کشمکش اور اکثریت سے تعلقات استوار رکھنے کی جد و جہد نے مختلف راہیں اختیار کی ہیں۔ جب وہ حاکم تھے تو صورتِ حال کچھ اور تھی اور جب ایک غیر ملکی حکومت کے محکوم ہوئے تو اس کی نوعیت بدل گئی۔ آج جب نہ حاکمیت ہے نہ محکومی بلکہ جمہوریت کے قومی تجربہ میں ایک شریک کار کی حیثیت مسلمانوں کو بھی حاصل ہے' ان کا طریق کار کیا ہونا چاہئے اور اپنے مذہبی تہذیبی اور اقتصادی وجود کے ساتھ انہیں اس عظیم الشان ملک میں کیا مقام حاصل ہونا چاہئے، ڈاکٹر عابد حسین کی یہ عالمانہ تصنیف انہیں مسائل پر غور کرنے اور اپنے انداز میں ان کا حل بتانے کی ایک علمی کوشش ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین کے وسیع مطالعہ، تجزیاتی اور منطقی ذہن، مشاہدہ، انصاف پسندی اور دلسوزی نے پورے مسئلہ کا جائزہ لیا ہے اور ایک سائنسداں کی طرح ایک بار اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھا ہے۔ پھر قومی زندگی کی وحدت میں اس کی مجموعی حیثیت پر نگاہ ڈالی ہے۔ زندگی کا وہ متحرک آئینہ جس میں مسلمانوں کی زندگی عکس پذیر ہو رہی ہے تقریباً سو سال کی وسیع مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے بحث کی آسانی کے لئے اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ماضی نے جو مسائل پیدا کئے، حال جس طرح ان سے متاثر ہوا اور مستقبل میں ان کے حل کے جو امکانات پوشیدہ ہیں، سب ان کی نگاہ میں ہیں اور جائزہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر منزل استدلال اور منطق، تاریخی واقعات اور امثلہ کی مدد سے طے ہوئی ہے۔ اکثریت مسلمانوں کی اقلیت کو کس طرح دیکھتی ہے، اقلیت اکثریت سے کس طرح خوفزدہ ہے، تصادم اور کشمکش کی نوعیت

کیا ہے، خود مسلمانوں نے اپنے سیاسی موقف کی جستجو میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں، قوم پروری اور فرقہ پرستی کے درمیان کس انداز کی رسہ کشی رہی ہے ــــ ان تمام باتوں کا اس سے زیادہ واضح، سلجھا ہوا، منصفانہ اور علمی تجزیہ مشکل ہی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی دلائل کی مضبوطی کی بنا پر بڑی بے خوفی اور جرأت سے اکثریت کی زیادتیوں پر بھی تنقید کی ہے اور لاعلمی کی وجہ سے جو دھند پیدا ہوتی ہے اسے مٹانے کی راہیں بتائی ہیں۔ کتاب ختم کرتے کرتے یہ احساس قطعی ہو جاتا ہے کہ اگر مسلمان اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ اگر اپنے اندازِ نظر کو وقت کے تقاضوں کے ہم آہنگ بنالیں تو قومی وحدت اور یکجہتی کی کشمکش میں وہ اپنا رول بڑی خوبی سے ادا کر سکتے ہیں۔ کتاب کی زبان اور اندازِ بیان کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ایسی مشکل بحث میں کہیں بھی ابہام یا خشکی کا احساس نہیں ہوتا۔ یقیناً یہ اردو کے سیاسی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی شایع کیا جائے۔ مکتبہ جامعہ اس کے پیش کرنے پر مبارکباد کا مستحق ہے ــــ سید احتشام حسین

افکار فیض نمبر ــــ مکتبہ افکار رابسن روڈ کراچی ــــ قیمت بارہ روپے

مجلہ افکار نے خاص نمبر کے نئے سلسلے میں جوش اور حفیظ کے بعد ہند و پاک کے ہر دلعزیز اور اہم شاعر فیض پر ایک مفید، خوبصورت، فیض کے اور اپنے شایان شان ایک پونے آٹھ سو صفحوں کا خاص نمبر شایع کر کے ایک بڑے ادبی خلا کو پر کیا ہے۔ صہبا لکھنوی کا یہ کارنامہ یقیناً لائق تحسین ہے۔ فیض کے متعلق درجنوں معلوماتی، تاثراتی، تنقیدی مضامین جمع کرنا، انہیں سلیقہ سے مختلف ابواب میں تقسیم کرنا۔ خود فیض کے مطبوعہ کلام، مضامین اور خطوط کا انتخاب تیار کرنا اور غیر مطبوعہ نظمیں یکجا کر کے پیش کرنا، بڑا کام ہے اور صہبا نے اسی خوبی سے انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایسے مجموعہ کے تمام مضامین، درجنوں مضمون نگاروں کے خیالات اور تاثرات سے ہر شخص کا متفق ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اگر اس میں ایسے مقامات ہیں جو بحث کا موضوع بنتے ہیں تو یہ بھی دعوت فکر و نظر کا سامان ہے جس سے ہر ناقد فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض نمبر رسائل کی تاریخ میں ایک اہم کارنامہ ہے۔

سید احتشام حسین



اب کہ جنگ بندی ہو گئی ہے پاکستانی حکمرانوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس جنگ سے کشمیر کے مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوا اور اسلام کی کونسی خدمت ہوئی۔ اگر اب بھی انہوں نے یہ حقیقت ذہن نشین کر لی کہ جنگ سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ہندوستان آئندہ بھی اپنی علاقائی سالمیت اور قومی وقار پر حملے کا یوں ہی دندان شکن جواب دے گا اور کشمیر کو محکوم بنانے کا انکا خواب کبھی پورا نہ ہو گا تو یہ پاکستان اور پاکستانی عوام کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔

اس جنگ میں ہمارے جوانوں نے جس عدیم المثال شجاعت کا مظاہرہ کیا اسپر ہمیں فخر ہے اور ہمارے جو جوان مادر وطن کی حفاظت کے سلسلے میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے انہیں ہم دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ابھی ہماری آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ "اسلامی ملک" پاکستان کے مذہب دشمن دوست چین نے ہماری سرحدوں پر پھر شرارت شروع کر دی ہے۔ لیکن ہمارے جوانوں کے حوصلے بلند ہیں، عوام ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کا عزم کر چکے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ چینی جارحیت کے مقابلے میں بھی ہمیں کامیابی ہو گی کیونکہ فتح بالآخر حق کو حاصل ہوتی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ ہمارا ملک حق پر ہے۔

محمود احمد ہنر
۲۳ ۹/ ۶۵ ء

ہمیشہ

مورچھاپ بیڑی

پیجئے



بہترین تمباکو، صاف پتے

اور

ہوشیار کاریگروں

سے

تیار کی جاتی ہے

رفیق اینڈ سنس بیڑی والا احمد گنج الہ آباد

یہ غلط ہے کہ کوئی ایک دوا ہر مرض کے لئے مفید ہو سکتی ہے
لیکن یہ صحیح ہے کہ

روغنِ برق

بہت سے امراض کیلئے اکسیر ہے

روغن برق
رجسٹرڈ

کی ایک شیشی گھر میں رہے تو آپ ان تمام جسمانی امراض کا خود علاج کرلیں گے اور کسی ڈاکٹر کے محتاج نہیں رہیں گے۔

دردسر، دردکمر، دردگردہ، چوٹ، موچ، ورم زخم، ختنہ، گھٹنوں کا درد، منھوا، سینہ و پسلی کا درد، ورم جگر، ورم طحال، ورم مسوڑھ، ورم خصیہ، بواسیر، طاعونی گلٹی، کان کا درد، آنکھ کا درد، سرخی چشم، نزلہ، درد کام، لرزہ، بخار، بچوں کی کمزوری ولاغری، پسلی کا چلنا، معمولی پھوڑا یا پھنسی، جلنے، کٹنے اور بچھو و بھڑ کے ڈنک کیلئے

روغنِ برق

اکسیر ہے۔ اس کی روزمرہ کی مالش اعصاب کو قوت و صحت بخشتی ہے۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، پہلوانوں اور کھلاڑیوں کے لئے بے حد مفید اور بے مثال ہے

قیمت فی شیشی ۱ تولہ ۴۰ پیسہ – ۲½ تولہ ۸۰ پیسہ – ۵ تولہ ۱ روپیہ ۴۰ پیسہ – ۱۰ تولہ ۲/۸

نیوموں کیمیکل ورکس۔ الہ آباد

یاد رکھیں

چھوٹا کنبہ

خوشحال کنبہ ہوتا ہے



بچّوں کو تعلیم ملنی چاہیئے۔ اور اچھی خوراک بھی۔ اور ان کے رہن سہن کے حالات بھی صحت مندانہ ہونا چاہئیں۔ لہٰذا سمجھ دار والدین اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ ان کے اتنے ہی بچّے ہوں جن کی وہ دیکھ بھال اچھی طرح کر سکیں۔

برتھ کنٹرول کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے بالکل نیا طریقہ ہے۔ **لُوپ**۔

یہ سہل ہے اور برس بعد برس پوری طرح بچاؤ کرتا ہے۔ یہ مفت مہیا کیا جاتا ہے۔

تربیت یافتہ ڈاکٹر سے لُوپ کے بارے میں معلومات و مشورے حاصل کرنے کے لئے اپنے قریبی

فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر

میں تشریف لائیں

DA 65/218

قرآن پاک کی نشر واشاعت میں ایک حسین وجمیل اضافہ

مفہوم القرآن (منظوم)

جسکو

ہندوستان کے مختلف مکتبۂ فکر کے مشاہیر علمائے کرام نے اپنی دعاؤں کے ساتھ سراہا ہے

- ہر پارہ الگ الگ جلدوں میں نہایت اہتمام سے شائع ہو رہا ہے
- پارہ عم اور پارہ الف لام میم چھپ چکا ہے۔
- سیقول سے آٹھویں سپارے تک زیر طبع ہیں۔

ایک صفحہ پر
- عربی متن
- ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر

دوسرے صفحہ پر
- سلیس اور نہایت آسانی سے دلنشین ہو جانے والا مفہوم نظم میں جسے اردو کے معروف شاعر کیف بھوپالی نے نظم کیا ہے۔

دیدہ زیب سرورق۔ عمدہ کاغذ معیاری کتابت۔ عکسی طباعت

چھ[6] سورہ منظوم سورۂ یٰس[1]۔ سورۂ فتح[2]۔ سورۂ الرحمٰن[3] سورۂ واقعہ[4]۔ سورۂ الملک[5]۔ سورۂ مزمل[6] اور قرآنی دعائیں منظوم

اسی اہتمام اور آب وتاب سے جیبی سائز میں فوٹو آفسٹ سے چھپ کر تیار ہے۔ اپنے شہر کے تاجران کتب سے حاصل کیجیے یا براہ راست ادارہ کو لکھیے۔

معراج پبلی کیشنز۔ شیخ سلیم گیٹ۔ وارانسی یو۔پی

SHAHKAR

ALLAHABAD-1

Regd No. L 2005



نورانی تیل رجسٹرڈ

دورِ حاضر کی بہترین ایجاد ہے
جس کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے۔



درد۔ زخم۔ چوٹ کٹنے جلنے اور
طاقت کی مشہور دوا ہے

انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی